لکھنؤ کا عوامی اسٹیج

فہرست

دیباچہ

پس منظر

شاہی ڈرامے کے ابتدائی آثار

نصیر الدین حیدر کے عہد میں



سید مسعود حسن رضوی ادیب

شاہی رہس کا سازو سامان

پانچویں منزل: قیصر باغ کا جوگیا میلا

خلط مبحث

کلکتے میں شاہی رہس

ضمیمہ

تصویریں

بلاک واجد علی شاہ کے عہد کی قلمی رنگین تصویروں سے بنائے گئے ہیں ۔ جس تصویر میں شاہی رہس کا ایک منظر دکھایا گیا ہے، وہ جناب آغا حیدر حسن صاحب دہلوی کی ملک ہے ۔

بسلسلۂ صفحہ ۱۴۳ سطر ۱۷ کے بعد

شاہی رہس کے پہلے جلسے کے مصارف اور اعداد کا ایک ہم عصر مصنف کا بیان

"یک صد و چند اسامی محل از ہر قسم زنان و نسوانِ ہر قوم بہ نہایت عظمت و کیفیت بہ صرف دوازدہ لکھ سالیان موجود۔ و برائے آن جلسۂ راس یعنی داستانے و اشعار نظم کردہ موافق آں از جمع دیوان و پریان و رقاصان و مطربان آراستہ حکایتہا کہ بہ گوش از افسانہ ہا می رسید آن را بچشم نمایاں کردہ اند۔ اختراع خاص شاہی است کہ تا امروز احدے از سلاطین عشرت آئین را میسر نیامدہ و بخاطر نرسیدہ بود۔ ہر کس مثنوی مشہور غزالہ از تصنیف حضرت را دیدہ از آن معلوم تواند کرد کہ بخاص اظہار ایں جلسہ و صحبت چہاردہ پانزدہ ہزار روپیہ در ماہہ صرف می کردند ... نمائش دیوان از مردم قوم وحشی بہ لباس موافق آنہا ...... و نمائش پریان از زنان جمیلہ و شکیلہ با لباس ہائے فاخرہ و زیور مرصع آلات و پر ہائے ملونہ و مرصع ... ہمہ مقدمات مرقومہ مثنوی را از رائے العین خلائق نمودہ اند۔"

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ محل میں سو سے کچھ اوپر ہر قسم اور ہر قوم کی عورتیں بڑی شان اور کیفیت کے ساتھ بارہ لاکھ روپے سالانہ کے صرف سے موجود ہیں۔ ان کے لئے جلسۂ راس[1] یعنی ایک قصہ نظم کر کے اور اس قصے کے موافق دیووں، پریوں، رقاصوں اور مطربوں کو آراستہ کر کے ان حکایتوں کو جو افسانوں سے کانوں تک پہنچتی تھیں اُن کو آنکھوں سے دکھا دیا۔ یہ بادشاہ کا خاص ایجاد ہے جو آج تک کسی عشرت پسند بادشاہ کو میسر نہ ہوا تھا بلکہ خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔ جس کسی نے حضرت کی تصنیف مشہور مثنوی غزالہ[2] کو دیکھا ہو وہ معلوم کر سکتا ہے کہ خاص اس جلسے اور صحبت کو دکھانے کے لیے چودہ پندرہ ہزار روپے ماہوار صرف کرتے تھے۔ دیووں کی نمائش وحشی قوم کے مردوں سے ان کے موافق لباسوں میں .... اور پریوں کی نمائش حسین و جمیل عورتوں سے فاخرہ لباسوں، مرصع زیوروں، رنگ رنگ کے مرصع پروں کے ساتھ کی گئی .... تمام چیزیں جو مثنوی میں لکھی تھیں وہ دنیا کو آنکھوں سے دکھا دیں۔

---

[1] جلسۂ راس = رہس کا جلسہ [2] مثنوی غزالہ = مثنوی دریائے تعشق جس میں غزالہ اور ماہرخ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

دیباچہ

لکھنؤ کے شاہی اسٹیج کے بانی شہزادے مرزا محمد واجد علی خاں بہادر ۱۰ ذیقعدہ ۱۲۳۷ھ (۳۰ جولائی ۱۸۲۲ء) کو پیدا ہوئے۔ دادا نے لڑکپن میں ناظم الدولہ خورشید حشمت خطاب دیا۔ ان کی تعلیم و تربیت ایک شہزادے کی طرح ہوئی امین الدولہ امداد حسین خاں اُن کے خاص اتالیق تھے اور انھوں نے دو کتابیں میزان الطب اور شرح اسباب اُن سے پڑھی تھیں[1]۔ یہ وہی امین الدولہ ہیں کہ لکھنؤ میں امین آباد اور امین الدولہ پارک اب بھی اُن کے نام کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔

شہزادے مرزا واجد علی بیس برس سے پچیس برس کی عمر تک اپنے والد امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے ولی عہد رہے اور ابوالمنصور سکندر جاہ سلیمان حشم صاحب عالم ولی عہد بہادر خطاب پایا۔ اس زمانے میں شاہی قلم دان کی خدمت ان کے سپرد تھی[2]۔ وہ روزانہ صبح کو تین گھنٹے دادخواہوں کی عرضیاں اور عرضداشتیں پڑھنے، شاہی احکام نافذ کرنے، شہر و دیار کے پرچہ ہائے اخبار سننے، اور غلّے اور دیگر اجناس و اشیا کا رُخ دریافت کرنے میں صرف کرتے تھے[3]۔ امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ (۱۳ فروری ۱۸۴۷ء) کو اودھ کے تخت پر بیٹھے اور ابوالمنصور سکندر جاہ بادشاہِ عادل قیصرِ زماں سلطانِ عالم محمد واجد علی شاہ کا لقب اختیار کیا۔

جب کوئی بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا تو ایک فرمان کے ذریعے سے تمام سرکاری

---

۱ محل خانۂ شاہی ص ۲۸۔ ۲ محل خانۂ شاہی ص ۴۳۔ ۳ تزکِ شاہی ص ۵

ملازموں کو برطرف کر کے اپنے حکم سے اُن کو یا اُن کی جگہ دوسروں کو نوکر رکھتا تھا، مگر اس انسانیت دوست اور رعایا پرور بادشاہ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس قدیم دستور کے خلاف تمام سرکاری ملازموں کی برطرفی کے بجائے اُن کی بحالی کا فرمان جاری کیا اور بعضوں کے خطاب، منصب اور تنخواہ میں اضافہ کیا۔ صرف فوج کے چند نااہل افسروں کو برخاست کر دیا، مگر تنخواہ اور عزت ان کی بھی برقرار رکھی[۱]۔ انتظام سلطنت کے سلسلے میں سب سے پہلے اپنی فوج کی درستی کی طرف متوجہ ہوئے اور کئی نئی پلٹنیں[۲] اور رسالے بھرتی کیے۔ روزانہ صبح کی نماز پڑھ کر پریڈ کے میدان میں پہونچ جاتے تھے اور فوجی قواعد کی جو فارسی اصطلاحیں خود ایجاد کی تھیں اُن کے موافق تین چار گھنٹے فوج کو قواعد کرواتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ اگر فوج کا کوئی دستہ وقت پر پریڈ کے میدان میں نہ پہونچے تو اُس پر دو ہزار روپے جرمانہ کیا جائے اور اگر وہ خود سلطنت کے ضروری کاموں کے علاوہ کسی اور وجہ سے غیر حاضر ہوں تو ان پر بھی اتنی ہی رقم جرمانہ کر کے فوج میں تقسیم کر دی جائے[۳]۔ اُن کی یہ فوجی سرگرمیاں انگریزوں کو پسند نہ آئیں اور وہ ان کو ترک کرنے پر مجبور کیے گئے[۴]۔

سلطنت کی ابتدا میں چاندی کے دو مقفل صندوق جن پر "شغلۂ سلطانی عدل نوشیروانی" کے الفاظ کندہ تھے، واجد علی شاہ کی سواری کے ساتھ رہتے تھے اور لوگوں کو اپنی عرضیاں اُن میں ڈالنے کی عام اجازت تھی۔ بادشاہ خود ان صندوقوں کو کھولتے اور عرضیوں پر مناسب احکام صادر فرماتے تھے[۵]۔ مگر اس سے بد دیانت اہل کاروں اور

۱؎ اسرار واجدی ص ۷ ۲؎ دو ہندوستانیوں کے قلم سے غدر دہلی کا بیان (بزبان انگریزی) ص ۲۱، ص ۱۱۴
۳؎ دو ہندوستانیوں کے قلم سے غدر دہلی کا بیان ص ۲۱، آفتاب اودھ، نادر العصر ص ۱۲۵، ۱۲۶ ۴؎ وزیرنامہ
افسانۂ لکھنؤ ص ۱۴۱ ۵؎ آفتاب اودھ، بوستان اودھ ص ۱۲۷، منتخب تنقیح الاخبار ص ۵۸



واجد علی شاہ فوجی قواعد کے میدان میں

خائن مصاحبوں کی قلعی کھلتی تھی۔ اس لیے انھوں نے ان صندوقوں میں ایسی فتنہ انگیز تحریریں ڈلوانا شروع کیں، جو نوجوان بادشاہ کے خلاف مزاج ہوتی تھیں۔[۱] آخر یہ شغلہ بھی ترک کرنا پڑا۔

مختصر یہ کہ ایک طرف انگریزوں کے ایجنٹ، غدار اہل کار ہر انتظام میں رخنہ ڈالتے رہتے تھے، دوسری طرف رزیڈنٹ ہر معاملے میں دخل دیتا تھا اور بے بنیاد الزام لگا لگا کر بادشاہ کو عاجز کرتا رہتا تھا۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ ابھی سلطنت کو صرف دو سال ہوئے تھے کہ بادشاہ سخت بیمار ہو گئے۔ کوئی دس مہینے میں شفا ہوئی تو اُن کو بتاکید مشورہ دیا گیا کہ اپنی صحت برقرار رکھنے کے لیے انتظام سلطنت کی جاں کاہ مصروفیتوں سے الگ ہو کر سیر و تفریح میں وقت صرف کریں۔[۲] ان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ان کی بادشاہی بلکہ اُن کی زندگی کا انحصار اسی پر ہے کہ وہ امور سلطنت میں دخل دینے سے کلیۃً احتراز کریں۔[۳]

ان سب چیزوں نے مل کر آخر کار اس حوصلہ مند بادشاہ کو اتنا بددل کر دیا کہ اس نے سلطنت کا انتظام اپنے وزیر اور خسر نواب علی نقی خاں کے حوالے کر دیا اور ان کی ہدایت کے لیے ایک دستور العمل دستور واحدی کے نام سے لکھ کر ان کے سپرد کیا۔ اس میں وہ قوانین و احکام بھی شامل کر دیے جو اپنی دو سال کی حکومت میں وقتاً فوقتاً نافذ کیے تھے۔[۴] اب وہ صرف اہم ملکی معاملات میں مشورہ دیتے تھے اور سنگین مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔[۵] اس طرح حالات سے مجبور ہو کر واحد علی شاہ کو انتظام سلطنت سے

۱۔ محل خانۂ شاہی ص ۱۲۹ ۲۔ وزیر نامہ ص ۱۳۱ و ۱۵۲

۳۔ مکتوب سلیمن بنام کرنل لو مورخہ ۵ مارچ ۱۸۵۴ء

۴۔ وزیر نامہ ص ۱۳۰ ۵۔ آفتاب اودھ قلمی

بڑی حد تک دست بردار ہوجانا پڑا، اور ان کو اپنے مذاق کے مطابق کتب بینی شا
تصنیف وتالیف اور فنون لطیفہ کی سرپرستی کے لیے کافی وقت ملنے لگا۔

واجد علی شاہ کی سلطنت کو نو سال ہوئے تھے کہ انگریزوں نے اُن کے خلا
طرح طرح کے الزام تراش کے ان کی معزولی کے اسباب فراہم کیے۔ بادشاہ نے
الزاموں کے مدلل جواب دیے جو کتابی صورت میں جواب اودھ بلیو بک کے نام
شائع بھی ہو گئے[1]۔ مگر ان جوابوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور انھیں فروری ۱۸۵۶ء میں
وتاج سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ ان کی معزولی کا اصل سبب انگریزوں کی الح
کی پالیسی تھی۔ اسی پالیسی کے ماتحت پنجاب اور بنگال کی ریاستوں پر انگریزو
قبضہ ہو چکا تھا اور ان کی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اودھ کی مملکت جو اس وقت
ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست تھی وہ بھی انگریزی راج میں شامل کر لی گئی۔

مارچ ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ اپنی سلطنت کی واپسی کا مقدمہ برطانی
میں پیش کرنے کے ارادہ سے سارے شہر کو ماتم کدہ بنا کر زبانِ حال سے یہ شعر پ
ہوئے لکھنؤ سے رخصت ہو گئے۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

وہ لندن کے ارادے سے چلے تھے۔ اس بنا پر ایک لکھنوی شاعر اہلِ شہر کے جذبا
کی ترجمانی یوں کرتا ہو۔

لکھنؤ بے کس ہوا حضرت جو لندن کو گئے
ہم یہاں نالاں ہیں وہ فریادِ دشمن کو گئے
(شہید شاگرد ناسخ

---

[1] اس کتاب کا ایک نسخہ راقم کے کتب خانہ میں موجود ہو۔

مگر کلکتے پہونچ کر اُن کو مجبوراً وہیں ٹھہر جانا پڑا۔ لکھنؤ میں مدت تک اُن کی واپسی کا انتظار ہوتا رہا۔ وہی شاعر کس حسرت سے کہتا ہے:۔

فصلِ گل کب آئے گی کب ہوں گے آ کر نغمہ سنج
ایک مدت ہو گئی مرغانِ گلشن کو گئے

مگر لکھنؤ کے گلشن میں وہ بہار پھر نہ آئی اور مُرغانِ گلشن کے وہ نغمے پھر سنائی نہ دیئے اور وہ مظلوم و معزول بادشاہ اپنے شہر و دیار سے دور کوئی بتیس برس جلاوطنی کی زندگی بسر کر کے ۲۳ر محرم ۱۳۰۵ھ (۲۱ر ستمبر ۱۸۸۷ء) کو قمری حساب سے سڑسٹھ اور شمسی حساب سے پینسٹھ برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

واجد علی شاہ کی علمی استعداد بہت اچھی اور اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ عہدِ شاہی میں بھی تصنیف و تالیف کا شغل رہتا تھا۔ معزولی کے بعد وہ اور زیادہ وقت اس مشغلے میں صرف کرنے لگے۔ راجا درگا پرشاد سندیلوی لکھتے ہیں۔

"ان کا سا کوئی بادشاہ علوم و فنون کی اس جامعیت کے ساتھ ہند کی سرزمین سے نہیں اٹھا اور اس فضل و کمال کے کسی فرماں روا نے ہندوستان کی فضا میں بادشاہی کا علم بلند نہیں کیا۔ ... ... ان دنوں اگرچہ سلطنت کے انتزاع، آمدنی کی قلت اور مصارف کی کثرت کے باعث خاطرِ اقدس کو طرح طرح کی فکروں کا سامنا ہے، لیکن ... ... اپنا وقتِ عزیز بیشتر علمی تذکروں میں صرف کرتے ہیں اور اپنے متوسّلوں کو اپنی تازہ بتازہ تصنیفات اور نو بنو تالیفات سے بے انتہا فیوض پہونچاتے رہتے ہیں۔" (ترجمہ)

واجد علی شاہ کی لکھی ہوئی مختلف موضوعوں پر اردو اور فارسی میں نثر و نظم کی چھوٹی

بڑی کتابوں کی تعداد سو سے اوپر پہونچ گئی تھی۔ اُن میں سے کوئی ساٹھ کتابیں راقم کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

واجد علی شاہ نہایت مہذب، منکسر مزاج اور رحم دل انسان تھے۔ اپنے یہاں کی شاہانہ تقریبوں میں مہمانوں کی خاطر تواضع بہ نفس نفیس خود فرماتے تھے اور سب کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کرتے تھے۔ اپنے محکوموں اور ملازموں کو دوستانہ لہجے میں تحریریں لکھتے تھے اور غریبوں کا بہت خیال رکھتے تھے[1]۔ ایک ہم عصر مؤرخ انتزاع سلطنت کے کئی سال بعد ان کی سیرت کے بارے میں لکھتا ہے۔

"اس بادشاہ عالی جاہ کو خدائے تعالیٰ نے بہت صفات جمیلہ عطا فرمائے ہیں۔ اوّل حلم اور انکسار کہ باوصف ایام جوانی اور حکومت و سلطنت کے کبھی کسی پر ظلم و جبر نہیں کیا، بلکہ تمام عمر لفظ درشت و دشنام وغیرہ کبھی زبان مبارک پر نہ آیا۔ دوسرے عدالت کہ جس مقدمے کی ان کو خبر پہونچی کبھی انصاف کو ہاتھ سے نہ دیا۔ تیسرے صلاح و تقویٰ کہ اگرچہ عین شباب میں سلطنت ملی مگر خیال مے نوشی بلکہ جملہ مسکرات وغیرہ امور منہیہ شرعیہ کا پیرامون خاطر عاطر نہ ہوا، پابندی صوم و صلوٰۃ میں کبھی فرق نہ آیا۔ چوتھے قابلیت و استعداد کہ باوصف اشتغال سلطنت کے چند مثنویاں اور رسائل علم موسیقی وغیرہ میں اور دیوان شعر تصنیف کیے۔ پانچویں ذہن ذکا کہ جس کام کی طرف اندک توجہ فرمائی اس کو جلد تکمیل کو پہونچایا۔ علاوہ ان کے اور بھی بہت صفات نیک کے جامع ہیں۔ ... ابتدائے سلطنت میں جب وقت ملاحظہ کاغذات ملکی و مالی فرماتے تھے بہ مقتضائے ذکاوت خلقی ایسی ایسی باریکیاں نکالتے تھے کہ بڑے بڑے دانشمندوں کے ہوش جاتے تھے[2]۔"

---

[1] اسرار واجدی صفحہ ۸۸-۸۹ [2] آفتاب اودھ

دوسرے مورخوں نے بھی اسی طرح کے اوصاف کا اپنے اپنے طور پر ذکر کیا ہے۔ اودھ کے ہندوؤں کو سری کرشن سے بڑی محبت ہے۔ اُن کی بچپن کی شرارتیں، ان کا گوپیوں کے ساتھ کھیلنا، اُن کا بانسری بجا کر دلوں کو موہ لینا وغیرہ، یہ سب چیزیں جو کرشن کی لیلائیں کہلاتی ہیں، اُن کو بہت محبوب ہیں۔ اودھ کے گیت، خاص کر ہولیاں کرشن اور رادھا کی محبت کے تذکروں سے بھری پڑی ہیں۔ رقص کی بہت سی صورتیں بھی کرشن سے منسوب ہیں۔ اودھ کے وہ مسلمان بھی جو رقص و موسیقی کے دلدادہ ہیں، سری کرشن سے ایک طرح کا دلی لگاؤ رکھتے ہیں۔ اُن کے بنائے ہوئے گیتوں کا پس منظر بھی بیشتر کرشن اور رادھا کا عشق ہوتا ہے۔ واجد علی شاہ بھی کرشن کے حالات سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ اِن کے تفریحی مشغلوں میں کرشن کی ابتدائی زندگی کے واقعات کا پرتو صاف نظر آتا ہے، جیسا کہ کتاب کے آئندہ اوراق سے ظاہر ہوگا۔

واجد علی شاہ کو فنونِ لطیفہ سے فطری دلچسپی تھی۔ مصوری، معماری، باغبانی، شاعری، موسیقی میں ان کو کافی دستگاہ تھی۔ انھوں نے لکھنؤ اور مٹیا برج میں سیکڑوں عمارتیں بنائیں، بہت سے باغ لگائے، اپنے منظوم کلام سے کئی دفتر بھر دیے، سیکڑوں گیت بنائے جو مختلف تقریبوں اور تہواروں میں گھر گھر گائے جاتے تھے۔ رجب علی بیگ سرور ان کے گیتوں کا دوسروں کے بنائے ہوئے گیتوں سے مقابلہ کرکے اُن کی امتیازی شان یوں بیان کرتے ہیں۔

"کسی بنانے والے کے انترے میں چار پانچ فقرے ہیں تو آستائی کے بیس بول ہیں، سیکڑوں گنجلک ہزاروں طرح کے بھول ہیں۔ جتنے نامور گویے ہوئے عروض و قافیہ میں کس کو دخل ہوا، شاعر کون تھا؟...... سانچے کے ڈھلے انترے آستائی کس نے بنائے ہیں؟۔ تقطیع میں پورے بول کس کے

اتر آئے ہیں؟"[1]

واجد علی شاہ اور اُن کی خاص محل کے گیتوں کے دو مجموعے خود بادشاہ کے ترتیب د...
ہوئے کتابی صورت میں اب بھی موجود ہیں۔

فن موسیقی کی قدر دانی اور سرپرستی ہندوستان کے راجاؤں اور بادشاہوں کا...
تھا۔ اودھ کے حکمراں بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ "نواب شجاع الدولہ کی قدر دانی...
فیاضی نے سارے ہندوستان کے موسیقی دانوں کو اودھ کی سرزمین پر لا کے اکٹھا کر...[2]
شجاع الدولہ بادشاہ اودھ کو فطرتاً عورتوں کی صحبت پسند تھی۔ لہٰذا بازار...
عورتیں اور اُن کے گانے والے طائفے اس قدر کثرت سے تھے کہ کوئی محلہ یا کوچہ ایسا...
تھا کہ جہاں وہ موجود نہ ہوں اور مالی اعتبار سے اُن کی حالت ایسی اچھی تھی کہ اُن میں...
اکثر رنڈیاں ڈیرے دار تھیں اور اُن کے ساتھ دو دو تین تین خیمے رہا کرتے تھے۔ نواب...
وزیر جب اضلاع کا دورہ کرتے تھے تو اُن کے ڈیرے بھی نواب وزیر کے ڈیروں کے...
ساتھ چلا کرتے تھے۔ فوجی حکام اور امرا علانیہ اپنے آقائے نعمت کی یہ وضع اختیار...
کر رہے تھے"[3]

آصف الدولہ کے عہد میں موسیقی کی ایک بلند پایہ کتاب اصول النغمات الآصفیہ...
لکھی گئی[4] اور انہیں کے نام معنون کی گئی۔ غازی الدین حیدر کو موسیقی کا بہت شوق تھا...
نصیر الدین حیدر کے یہاں ناچنے گانے والیوں کا شمار مشکل تھا۔ واجد علی شاہ کے و...
امجد علی شاہ بڑے مذہبی آدمی تھے۔ اُن کے عہد میں سلطنت کا سارا کاروبار علمائے مذہب...

۱ے فسانۂ عبرت صـ ۱۲۱ ۲ے گزشتۂ لکھنؤ صـ ۱۶۶
۳ے تاریخ فرح بخش مصنفہ فیض بخش کاکوروی۔ بحوالہ ابواللیث صدیقی۔
۴ے گزشتۂ لکھنؤ صـ ۱۶۹

کے ہاتھ میں تھا۔ مگر ارباب نشاط کا محکمہ اُن کے یہاں بھی موجود تھا[۱]۔

واجد علی شاہ موسیقی اور رقص کے صرف سرپرست ہی نہ تھے بلکہ انھوں نے ان فنون کو بڑی محنت سے حاصل کیا تھا۔ ممکن ہو کہ وہ استادی کا درجہ نہ رکھتے ہوں، لیکن ان کی متعدد تصنیفیں گواہ ہیں کہ ان کو ان فنون میں اچھا خاصہ دخل ضرور تھا۔ لکھنؤ کے مشہور باکمال رقاص مہراج بندادین فخریہ کہا کرتے تھے کہ رقص کی بہت سی صورتیں خود بادشاہ نے مجھ کو سکھائی ہیں۔

ناچ گانے سے واجد علی شاہ کو حظّاً نفس مقصود نہ تھا۔ اُن کے نزدیک اچھے گانے کا معیار رُلا دینا تھا، جس کا ذکر انھوں نے اپنی کتابوں میں بارہا کیا ہے[۲]۔ لکھتے ہیں ناچنے گانے والیوں کے جو جلسے انھوں نے مرتب کیے تھے ان میں سے دو کے متعلق لکھتے ہیں۔

"رادھا منزل والیوں اور سلطان خانے والیوں پر ایسی ایسی محنتیں کیں کہ صبح کا کھانا شام کو اور شام کا صبح کو نصیب ہوا۔ مگر آخر کار ان صاحبوں نے بسبب تاثیر صحبت شبانہ روزی ڈوم ڈھاڑیوں کا سا مزاج پیدا کیا۔۔۔۔۔ علم کی طرف بالکل توجہ نہ کی، مزے کی طرف رجوع ہوئیں[۳]۔"

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہو کہ واجد علی شاہ موسیقی کو مزے کے لیے نہیں، بلکہ علم کی حیثیت سے سیکھنا سکھانا چاہتے تھے۔ وہ اس کے لیے خود بھی بڑا ریاض کرتے تھے اور دوسروں سے بھی اس کی توقع رکھتے تھے اور ڈوم ڈھاڑیوں کا سا مزاج ان کو بہت ناپسند تھا۔

۱؎ محل خانۂ شاہی ص ۱۴۲-۱۴۳

۲؎ مثلاً ملاحظہ ہو بنی ص ۳۱۹ صوت المبارک ص ۶ محل خانۂ شاہی ص ۱۹ ۳؎ بنی ص ۳۲۳

اس میں شک نہیں کہ واجد علی شاہ اپنے زمانے میں موسیقی اور رقص کے سب سے بڑے سرپرست تھے۔ ہندوستان کی پیچیدہ اور مشکل کلاسیکی موسیقی کو آسان اور عام پسند بنانا ان کا خاص کارنامہ ہو اور لکھنوی ٹھمری اور بھیرویں کی مقبولیت انھیں کی مرہون منت ہے۔ لیکن ناٹک کے فن پر ان کا احسان موسیقی سے بھی زیادہ ہو۔ یہ فن ہمارے ملک میں بالکل ذلیل ہو چکا تھا اور صرف ادنیٰ طبقوں میں بہت بگڑی ہوئی صورت میں باقی رہ گیا تھا۔

واجد علی شاہ نے اس کو ذلت کے گڑھے سے اٹھا کر عزت کے سنگھاسن پر بٹھایا اور گلی کوچوں سے نکال کر شاہی محل میں پہونچایا۔ فنون لطیفہ کے اس عظیم سرپرست نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا اس کی تفصیل تو اس کتاب کے آئندہ ورقوں میں ملے گی، یہاں صرف ایک بات کہنا ہو۔ واجد علی شاہ سر سے پاؤں تک پکے ہندوستانی تھے۔ انگریزوں سے انھیں مطلق انس نہ تھا اور ان کے دربار میں انگریزوں کا ذرا سا بھی دخل نہ تھا۔ کلکتہ اور بمبئی میں انگریزی طرز کے اسٹیج مدت سے قائم تھے اور ان کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کر لینا ان کے لیے کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ مگر انھوں نے لکھنؤ میں جس اسٹیج کی بنیاد ڈالی وہ خالص ہندوستانی تھا۔ اس میں ہندوستان کے قدیم اسٹیج کی پیروی قدم قدم پر نظر آتی ہے۔

قدیم ہندوستانی اسٹیج میں سبھا نائک یعنی صدر جلسہ یا بانی محفل کی شخصیت بہت اہم ہوتی تھی۔ کھیل کی خوبیوں کو ظاہر کرنا اور مغنیوں، رقاصوں اور اداکاروں کو انعام دینا اس کا کام تھا۔ لکھنؤ کے شاہی اسٹیج میں واجد علی شاہ کی حیثیت سبھا نائک کی تھی[۱]۔ ابھنے درپن کے مصنف نندی کیشور نے سبھا نائک کے حسب ذیل اوصاف

۱۔ گزشتہ لکھنؤ صـ ۱۷۱

بتائے ہیں۔

"دولت مند، ذہین، صاحب امتیاز، صاحب الرائے، موسیقی داں،

ہمہ رنگ، نام آور، خوش صفات، دلی خواہشیں اور طبعی کیفیتیں ظاہر کرنیوالے

اشاروں سے بخوبی واقف، بغض وحسد سے پاک، خنداں پیشانی، خوش الحوار،

مہربان، صابر، مہذب، فنون لطیفہ سے واقف، ابھنے کا ماہر۔"

واجد علی شاہ میں یہ تمام اوصاف پورے طور پر موجود تھے۔

واجد علی شاہ کے زمانے تک اردو میں ڈرامے کا وجود نہ تھا۔ اس اہم صنف ادب کی بنیاد ڈالنے کا فخر ان کے لیے اٹھ رہا تھا۔ انھوں نے ولی عہدی کے دنوں میں رادھا کنھیا کی داستان محبت پر مبنی ایک چھوٹا سا ناٹک لکھا جو ہماری خوش قسمتی سے اب تک موجود ہے۔ فنی اعتبار سے اس کا درجہ کچھ بھی ہو، اردو کا پہلا ڈراما ہونے کی حیثیت سے وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ حضرت مصنف ڈرامے کے ساتھ ساتھ اداکاروں کے لیے ہدایتیں (stage directions) بھی لکھتے گئے ہیں، جن سے اس ادب پارے کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ اس دوہری اہمیت کی بنا پر وہ ڈراما مع ان ہدایتوں کے کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر شامل کر دیا گیا ہے۔

واجد علی شاہی ڈرامے اور اسٹیج پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی جا چکی ہے، لیکن اگلے اہل قلم نے ناکافی معلومات کی بنا پر جو کچھ لکھا اس سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ بعد کے لکھنے والوں سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ تحقیق سے کام لے کر ان غلط فہمیوں کو دور کریں گے۔ لیکن اس توقع کے خلاف ہوا یہ کہ جو کوئی اس موضوع پر لکھنے بیٹھا اس نے کچھ نئی غلط فہمیوں کا اضافہ کر دیا۔ ان لکھنے والوں کی نیک نیتی میں شبہہ نہیں، مگر

ل The Indian Theatre by C. B Gupta ہندوستانی تھیٹر

گراں سے یہ شکایت ضرور ہو کہ انھوں نے تحقیق کی ذمہ داریوں کو ملحوظ نہیں رکھا اور ماخذوں کی تلاش اور مواد کی فراہمی میں سہل انگاری سے کام لیا۔ ضرورت تھی کہ اردو ڈرامے کی مستند تاریخ لکھی جائے تاکہ عہد حاضر کے ایک ادیب کے الفاظ میں "ان غلط بیانیوں کا جلد از جلد سدباب ہو جو مروجہ غلط تاریخ کی موجودگی کی بنا پر بعض ارباب قلم کے ذریعے اس فن کے طالب علموں کے درمیان فروغ پا رہی ہیں اور ان کے علم میں اضافہ کرنے کی جگہ مزید غلط فہمیاں پیدا کرنے کا باعث ہو رہی ہیں۔"[1]

اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے راقم حروف نے ماخذوں کی تلاش و دستیابی اور مواد کی فراہمی و ترتیب میں برسوں کا وقت صرف کر کے اردو ڈرامے اور اسٹیج کے پہلے دور کی مستند تاریخ تیار کر دی ہے جو دو حصوں میں پیش کی جا رہی ہے، ایک لکھنؤ کا شاہی اسٹیج: واجد علی شاہ اور رہس اور دوسرا لکھنؤ کا عوامی اسٹیج: امانت اور اندر سبھا۔ اگر اسی طرح چند اہل قلم ایک ایک دور کو اپنی تحقیق کا موضوع قرار دے لیں تو ڈرامے کی مکمل تاریخ تیار ہو جائے اور غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کا دروازہ بند ہو جائے۔

سید مسعود حسن رضوی

۲۵ اگست ۱۹۵۷ء

---

[1] عشرت رحمانی کا مقالہ "اردو ڈرامے کی ایک صدی" ادب لطیف، لاہور، ڈراما نمبر، بابت اکتوبر، نومبر ۱۹۵۴ء

لکھنؤ کا شاہی اسٹیج

پس منظر

ڈرامے کی ابتدا تہذیب و تمدن کی منزل تک پہونچنے سے پہلے ہر قوم کے تفریحی مشاغل میں ڈرامائی عناصر پائے جاتے ہیں۔ لیکن دنیا میں سب سے پہلے جس قوم نے ان عناصر کو ترتیب دے کر ڈرامے کی تخلیق کی وہ اہلِ یونان تھے۔ یونان میں چھٹی صدی قبل مسیح میں ٹریجڈی یا المیہ اور پانچویں صدی قبل مسیح میں کمیڈی یا طربیہ نے جنم لیا ابتدا میں یہ ڈرامے پہاڑیوں کے دامن کے کھلے میدانوں میں دکھائے جاتے تھے۔
پانچویں صدی قبل مسیح کے وسط میں پہلا باقاعدہ تھیٹر یا تماشاخانہ تیار ہوا۔ پردوں پر سین پینٹ کرنا یعنی منظروں کی تصویریں بنانا اور طرح طرح کی مشینوں کا استعمال بھی اسی زمانے میں شروع ہوا۔

یونانی ڈراما اور تھیٹر کو شروع ہوئے جب بہت طولانی مدت گزر چکی اور یہ دونوں چیزیں ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر چکیں تو اٹلی میں ان کی بنیاد پڑی۔ ابتدا میں ایک مدت تک لکڑی کے تھیٹر بنتے رہے۔ ۱۵۴ء قبل مسیح میں پتھر کا پہلا تھیٹر تعمیر کیا گیا۔ مگر سنیٹ کے حکم سے اس کو منہدم کرنا پڑا۔ کوئی سو برس بعد یعنی پچاس یا پچپن سال قبل مسیح پہلا مستقل سنگین تھیٹر تیار ہوا۔ رفتہ رفتہ اٹلی نے ڈرامے اور تھیٹر میں ایسی ایجادیں اور نئی ترقیاں کیں کہ یونانی تھیٹر کو مات کر دیا۔ اٹلی کے بعد اور اسی کے اثر سے جرمنی میں دسویں صدی عیسوی میں اور فرانس اور اسپین میں

بارہویں صدی عیسوی میں مذہبی ڈرامے کی ابتدا ہوئی۔ انگلستان میں پہلا مذہبی ڈراما سنہ ۱۱۱۰ء میں اور پہلا غیر مذہبی ڈراما سنہ ۱۲۶۸ء میں کھیلا گیا۔

ناٹک کی قدامت ہمارے ملک ہندوستان میں بھی ایک طرح کا ڈراما جو ناٹک کہلاتا ہے، بہت قدیم زمانے میں پیدا ہو چکا تھا۔ اس کے وجود میں آنے اور عالم بالا سے دنیا میں اترنے کے متعلق کئی روایتیں ہیں۔ ہندوؤں کے عقیدے میں دیوتاؤں کی ایک دنیا ہے اور اندر وہاں کا راجا ہے۔ اس دنیا کے بسنے والے اپنی بے کاری سے عاجز تھے ایک مرتبہ اندر اور دوسرے دیوتاؤں نے برہما سے التجا کی کہ عالم بالا کے رہنے والوں کے شایان شان کوئی تفریحی مشغلہ مہیا کیا جائے۔ برہما نے چاروں ویدوں کے عطر نکال کر ان کے مجموعے سے رقص کا فن بنایا اور اپنی اس نئی تخلیق کو ناٹیہ وید سے موسوم کر کے اس کو چاروں ویدوں کا تقدس اور عظمت عطا کی۔ یہ پانچواں وید برہما نے بھرت اور اس کے سو بیٹوں اور چیلوں کو عنایت کیا جنھوں نے بعد کو اسے زمین پر بسنے والے فانیوں تک پہونچا دیا۔[۱]

دوسری روایت یوں ہو کہ ایک مرتبہ اندر برہما کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک ایسے وید کی تخلیق کے لیے درخواست کی جو ان لوگوں کی دسترس میں ہو، جن کے لیے چاروں ویدوں کا مطالعہ ممنوع ہو۔ برہما نے یہ درخواست منظور کر لی اور ناٹیہ وید خلق کر کے بھرت منی کو یہ خدمت سپرد کی کہ وہ اس کو فانیوں میں مقبول بنائیں۔ اس عظیم منی نے اپنے سو لڑکوں اور چیلوں کو ناٹک کا فن سکھایا اور ہر ایک کے سپرد وہ پارٹ کیا جس کے لیے وہ نہایت موزوں معلوم ہوا۔ اس سلسلے میں ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ رقص کی بعض صورتیں ایسی ہیں جنھیں صرف عورتیں ادا کر سکتی ہیں۔ بھرت نے

---

[۱] تاندو لکشنم (انگریزی ترجمہ) ص۱

یہ صورت حال برہما سے بیان کی اور برہما نے کچھ حسین و جمیل عورتیں پیدا کر دیں جو اپسرائیں کہلاتی ہیں۔ اب بھرت منی اپنے اداکاروں کی پوری سنگت اور ایک آسمانی آرکسٹرا ساتھ لے کر برہما کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ برہما نے حکم دیا کہ اندر دھوج[1] کے میلے میں اپنا ہنر دکھاؤ۔ اس کے بعد برہما کے حکم سے آسمانی معمار وشوکرم نے بھرت اور اُن کے اداکاروں کے لیے ایک تھیٹر[2] تعمیر کر دیا۔

ناٹک کی پیدائش کا تفصیلی بیان بھرت منی کے ناٹیہ شاستر میں ملتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بہت قدیم زمانے میں جمبو دیپ کے باشندے بد اطوار ہو گئے اور لڑائی جھگڑا رشک و حسد اُن کا شعار ہو گیا، تو اندر اور دوسرے دیوتا برہما کے پاس گئے اور عرض کیا کہ پرانی دنیا کے اچھے طریقے اب بے کار ہو گئے ہیں۔ اب دنیا کی اصلاح کے لیے زیادہ سادے اور زیادہ دلچسپ طریقے درکار ہیں۔ شودروں کی تعداد بڑھ گئی ہے اور ویدوں کے مقدس علم تک اُن کی رسائی نہیں۔ اس لیے اب ایک پانچواں وید خلق کیجیے جو ذات پات کے امتیاز کے بغیر ہر شخص کی دسترس میں ہو۔ برہما نے یہ درخواست منظور کی اور موجودہ چاروں ویدوں سے مواد لے کر ناٹیہ وید خلق کیا، جس میں الفاظ رگ وید سے، موسیقی سام وید سے، عمل یجروید سے، اور رس اتھروید سے لیا۔ یہ ایک خاموش انقلاب تھا جس کو نئی اور پرانی دونوں دنیاؤں نے قبول کر لیا۔ اور اس طرح وہ ڈراما وجود میں آگیا جو اتہاس کہلاتا تھا۔ برہما نے اندر سے اس کو کھیلنے کی فرمائش کی۔ اندر نے عرض کیا کہ دیوتا اس کام کے اہل نہیں۔ تب یہ کام

---

[1] اندر دھوج، کے معنی ہیں اندر کا جھنڈا۔ یہ میلا برسات کے آخر میں ہوتا تھا اور اس میں اسُروں پر اندر کی فتح دکھائی جاتی تھی۔

[2] تانڈو لکشنم (انگریزی ترجمہ) ص ۵۰۹

بھرت منی کے سپرد کیا گیا۔ بھرت کے سو بیٹے تھے، انھوں نے اُن کو بڑی محنت اور دل سوزی سے تعلیم دے کر تیار کیا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں ان کو پتہ چل گیا کہ انھیں کچھ عورتوں کو بھی ساتھ لینا چاہیئے، کیوں کہ بعض پارٹوں کو مرد ادا ہی نہیں کر سکتے۔ ان کی درخواست پر برہما نے اپسرائیں مہیا کر دیں۔ پھر آسمانی گویّے مثل ناراد وغیرہ کے جمع کیے گئے اور 'اُسروں کی شکست' نام کا کھیل تیار ہو گیا۔ اسروں[1] کو یہ بات بہت ناگوار گزری کہ برہما نے ایسے کھیل کی اجازت دیدی، جس سے اہل شہر کے امن میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔ کھلے ہوئے میدانوں میں مخالفین کے لیے حملہ کر کے کھیل کو روک دینا آسان تھا۔ اس لیے حفاظت کے خیال سے دیواروں سے گھرا ہوا کھیل گھر ضروری ہو گیا۔ برہما نے بعد کو اس کی وضاحت کر کے کہ ڈراما کیا چیز ہے، اس کی غرض کیا ہو اور اُس سے کیا کیا کام لینا ہیں، اُسروں کو مطمئن کر دیا۔ جب کھیل گھر تیار ہو چکا تو بھرت اپنے اداکاروں کو ساتھ لے کر برہما کے پاس گئے اور پوچھا کہ اب کون ڈراما کھیلنے کا حکم ہوتا ہے۔ طے ہوا کہ 'امرت منتھن' کھیلا جائے۔ برہما کو یہ کھیل اتنا پسند آیا کہ انھوں نے پوری سنگرت کو شیو جی سے ملوایا اور ان کے سامنے ایک ڈراما کھیلا گیا، جس کا نام تھا 'ترپُرداہ' یعنی تین شہروں کا جلنا۔ شیو نے بھی ان ہونہار اداکاروں کی تعریف کی اور کھیل کو بہتر بنانے کے لیے اپنی ذاتی نگرانی میں ناچ اور گانا تماشے میں داخل کر دیا۔[2]

بھرت نے یہ بھی لکھا ہو کہ اندر کے آسمانی تھیٹر میں ایک ناٹک 'لکشمی سویم ور' کھیلا جا رہا تھا۔ خاص اپسرا اُروسی وشنو کی زوجہ لکشمی کا پارٹ کر رہی تھی۔ یکایک

---

[1] ایک طرح کے ہوائی مخلوقات جو دیوتاؤں سے بالعموم اور اندر سے بالخصوص عداوت رکھتے ہیں

[2] سنسکرت ادب میں ڈراما (بزبان انگریزی) رسو۔ جاگیردار، صنہ ۲۰۔ ۲۲

اس کو اپنا دنیوی عاشق یاد آگیا اور وہ اس کی یاد میں ذرا دیر کے لیے ایسی کھو گئی کہ مکالمے میں ایک بڑی غلطی کر گئی۔ برہما نے غصے میں آکر اُس کو بد دعا دی اور زمین پر اتار دیا۔ اس طرح ناٹک کا فن اروسی کے ساتھ اس دنیا میں آگیا[1]۔

ان اعتقادی روایتوں سے قطع نظر کرنے کے بعد اتنی بات تو تاریخ بھی بتاتی ہو کہ ہندوستان میں ناٹک کا وجود بہت قدیم زمانے سے ہو۔ اب سے صدیوں پہلے، جب دنیا کے بہت سے ملک ناٹک یا ڈرامے کا نام بھی نہ جانتے تھے[2] ہمارے ہندوستان میں بھاس، کالی داس، اسری ہرش، بھوبھوتی کے سے ڈراما نگار موجود تھے، جن کے شاہکار آج بھی ساری مہذب دنیا سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے راجا مہاراجہ اپنے محلوں میں اسٹیج تیار کرواتے تھے، جہاں یہ ناٹک بڑے اہتمام کے ساتھ کھیلے جاتے تھے۔ نٹ وِدّیا یعنی ایکٹنگ کا فن بھی بہت ترقی کر گیا تھا۔ اس فن کے متعلق اچھی اچھی کتابیں لکھی گئی تھیں، جن میں ایسے ایسے فلسفیانہ اور نفسیاتی نکتے پیش کیے گئے تھے کہ اُن کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔

ناٹک کا مقصد ہندوستان کے یہ قدیم ناٹک سنسکرت ادب کا نہایت اہم حصہ ہیں۔ وہ مغربی ڈراموں سے کچھ مشابہت ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کا مقصد اور ان کو پیش کرنے کا طریقہ مغربی ڈراموں سے بہت مختلف ہو۔ ناٹک کو سنسکرت میں ،ورشیہ کاویہ، اور ،ناٹیہ، بھی کہتے ہیں۔ ورشیہ کاویہ کے معنی ہیں وہ نظم جو دیکھی جا سکے، یعنی ایسی شعری تصنیف جسے پڑھ کر نہیں بلکہ اسٹیج پر پیش ہوتے دیکھ کر

---

[1] ہندوستانی تھیٹر (بزبان انگریزی) ر۔ک۔ یجنک صنہ ۲

[2] یورپ کے محقق ڈرامے کے فن میں اوّلیت کا سہرا یونان کے سر باندھتے ہیں، لیکن ہندوستانی علما کی تحقیق یہ ہو کہ سنسکرت ڈراما یونانی ڈرامے سے بھی قدیم تر ہو۔ ادیب

لطف اٹھایا جائے۔ ناٹیہ، وہی ناٹک ہو، اس کا مادّہ "نرت" ہو جس کے معنی ہیں ناچنا۔ یہ دونوں نام بتاتے ہیں کہ ناٹک میں ایکشن، یا عمل کا تصور نہیں ہو اور ناچ اس کا خاص جز ہو۔ ناٹک کا مقصد صرف یہ ہو کہ تماشائیوں کے جذبات کو ابھار کر ان کے لیے جمالیاتی مسرت بہم پہنچائی جائے۔ اس لحاظ سے وہ ڈرامے سے مختلف چیز قرار پاتی ہے۔

ابھنے، یعنی قدیم ہندوستانی ایکٹنگ یا اداکاری

ناٹک کو اسٹیج پر دکھانے کا فن آج سے کئی صدیوں پہلے مدون ہو چکا تھا اور "ابھنے" کہلاتا تھا۔ یہ فن بتاتا ہو کہ کسی ناٹک کے کیرکٹروں یا کرداروں کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیتوں کو کیوں کر دکھایا جائے کہ ناٹک میں جو حسن مضمر ہے اور جو مسرت بخش پہلو چھپے ہوئے ہیں وہ تماشائیوں کی چشم تصور کے سامنے آجائیں۔ ابھنے، ناچ سے ملتی ہوئی چیز ہے اور اس کا کام کرداروں کے افعال کی نقل مطابق اصل پیش کرنا نہیں ہے، بلکہ ان کے افعال، خیالات اور جذبات کی طرف تماشائیوں کے ذہن کو منتقل کر دینا ہے۔ اس مقصد کے لیے حسب ذیل چار طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔

۱۔ اعضا کی ارادی جنبشیں۔ چہرے کے اجزا اور جسم کے اعضا کو مقررہ قاعدوں کے مطابق حرکت دینا یا کھڑے ہونے کی مختلف مقررہ صورتیں اختیار کرنا۔

۲۔ آواز کی ارادی تبدیلیاں۔ آواز کا بڑھانا گھٹانا، لفظوں پر زور دینا، متوازن فقرے استعمال کرنا، لفظوں کا صحیح یا غلط تلفظ کرنا، خطاب کرنے کے مختلف طریقے اختیار کرنا، شہری اور دیہاتی بولیاں بولنا۔

۳۔ پوشاک اور آرائش۔ مختلف طرح کی پوشاکوں، زیوروں اور دوسری آرائشوں کے ذریعہ سے کرداروں کی جنس، قوم، فرقہ، پیشہ یا حیثیت وغیرہ کو ظاہر کرنا

۴۔ اضطراری کیفیتیں۔ چہرے اور جسم کے اُن تغیرات سے کام لینا جو مختلف قلبی کیفیتوں کے نتیجے میں بلاارادہ ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد آٹھ ہے، بے حس و حرکت ہو جانا، پسینا نکل آنا، رونگٹے کھڑے ہو جانا، آواز بدل جانا، کانپنے لگنا، چہرے کا رنگ بدل جانا، آنسو بہنے لگنا، بے ہوش ہو جانا۔

ابھنے کی ان چار صورتوں میں پہلی 'آن گِک ابھنے'، دوسری 'واچِک ابھنے'، تیسری 'آہاریہ ابھنے' اور چوتھی 'ساتوِک ابھنے' کہلاتی ہے۔ ساتوک ابھنے، کردار کی روح کو پیش کرتی ہے۔ اس میں جو آٹھ کیفیتیں طاری ہوتی ہیں وہ روح کی اندرونی گہرائیوں میں پیدا ہو کر سارے جسم پر چھا جاتی ہیں۔ ساتوک ابھنے سے صرف غیر معمولی فطری استعداد رکھنے والے اداکار پوری مشق و مہارت کے بعد کام لے سکتے ہیں، معمولی اداکاروں کے ہاتھ میں وہ اپنے درجے سے گر کر 'آن گک ابھنے' کی سطح پر آجاتی ہے۔[۱] ابھنے کے اس مختصر بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں، اور ایکٹنگ میں کچھ ظاہری مشابہت ضرور ہے۔ لیکن دونوں ایک چیز نہیں ہیں اور دونوں کا مقصد بھی ایک نہیں ہے۔

اوپر ابھی جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اصلیت پسندی (Realism) کا جو مفہوم آجکل سمجھا جاتا ہے اس کے لحاظ سے قدیم سنسکرت ناٹکوں میں اصلیت کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اب لوگ آرٹ میں اصلیت تلاش کرنے کے عادی ہو گئے ہیں لیکن ہند قدیم میں جن لوگوں نے آرٹ کے لیے اصول بنائے وہ تماشائیوں کی قوتِ تخیل کو متحرک کرتے رہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ انتہائی جذباتی مسرت بغیر اس کے حاصل ہو ہی نہیں سکتی کہ ناظرین کی تخیل کے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ

---

[۱] ابھنے درپن (انگریزی ترجمہ)

چھوڑ دی جائے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہند قدیم میں تمام فنون لطیفہ کی بنیاد انتقال ذہن کی قوت پر تھی۔ ان تمام چیزوں کو ذہن میں رکھنے کے بعد یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں ہوگا کہ قدیم ناٹکوں کے اداکاروں اور تماشائیوں کا نقطۂ نظر وہ نہیں تھا جو آجکل کے ڈراموں کے ایکٹروں اور تماشائیوں کا ہوتا ہے۔

ناٹک کا زوال بہرحال قدیم ہندوستان میں ایک طرح کے ڈرامے اور ایک طرح کی اداکاری نے خوب ترقی کی اور بڑی مقبولیت حاصل کی، مگر پھر کچھ ایسے اسباب پیش آتے رہے کہ ناٹک نے ہندوستان میں جتنی ترقی کی تھی اتنا ہی اس کو تنزل بھی ہوا یہاں تک کہ اب سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے ڈراما اپنا وقار بالکل کھو چکا تھا اور ایکٹنگ کا فن بالکل ذلیل سمجھا جانے لگا تھا۔ راجاؤں اور بادشاہوں کا کیا ذکر، سماج کے اونچے طبقوں میں سے کسی کو بھی ناٹک کی طرف کوئی توجہ نہیں رہی تھی۔ البتہ عوام کی مذہبی عقیدت کی بدولت چند مذہبی ناٹک باقی رہ گئے تھے۔ جن میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ مقبول وہ ناٹک تھے جن کے ذریعہ سے راجا رام چندر جی اور سری کرشن مہاراج کی زندگی کے بعض واقعات پیش کیے جاتے تھے اور جو "رام لیلا" اور "کرشن لیلا" کے ناموں سے موسوم تھے، اُن کے لیے کہیں کوئی مخصوص عمارت نہ تھی، کوئی باقاعدہ اسٹیج نہ تھا۔ وہ کھلے میدانوں میں، سڑکوں پر، بازاروں میں دکھائے جاتے تھے۔

رام لیلا اور رہس "رام لیلا" کے لیے سال میں چند دن مخصوص تھے، جن میں وہ ایک سالانہ یادگار کے طور پر جگہ جگہ دکھائی جاتی تھی۔ اس ناٹک میں مشاق اور پیشہ ور ایکٹر کام نہیں کرتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے رام لچھمن اور سیتا کی شبیہیں بنائے جاتے تھے اور یہ ایک ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا۔ یعنی "رام لیلا" کو صرف مذہبی حیثیت حاصل تھی، ڈرامے کی حیثیت سے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی، اور آج بھی

اس کی یہی حالت ہو۔

"کرشن لیلا" کی حالت کسی قدر مختلف تھی۔ اس کے لیے کوئی زمانہ مقرر نہ تھا۔ وہ بالعموم ان میلوں میں دکھائی جاتی تھی، جو سال کے مختلف حصّوں میں ہوتے رہتے تھے۔ کرشن لیلا، "رہس" کے نام سے مشہور ہو گئی تھی اور اس کو کھیلنے والے "رہس دھاری" کہلاتے تھے۔ رہس دھاریوں کی باقاعدہ منڈلیاں یعنی جتھے یا گروہ تھے۔ میلوں کے علاوہ بھی یہ منڈلیاں لوگوں کے یہاں اُجرت پر "رہس" کھیلنے جایا کرتی تھیں۔ سید انشاؔ نے ایک بے نقط قصہ "سلکِ گوہر"[1] کے نام سے اودھ کے فرماں روا نواب سعادت علی خاں

---

[1] اس قصے کو امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے مرتب کر کے ۱۹۴۸ء میں شایع کیا۔ اس میں "رہس" کے متعلق سید انشاؔ کا بیان حسب ذیل ہے۔

"اور واہ واہ! وہ رہس لالہ رام داس کا، اور وہ سارا عالم، اور کالا کمل والا گوالا، اور وہ سوامی کا لالا، اور وہ ادس، اور وہ گھاس، اور لاکھ گو کا دودھ، اور گئو داس، اور لاکھ گاگر، اور رس کا ساگر اور اس راگ کا لگاؤ اور راگ کا الاؤ، اور ہر ہر دل گ مرگ سا، ممولا سا، اور گوکل کا سارا اداسا۔ اور اودھر کا دھور اداسا، اور وہ دھوم دھام کا ڈولا، اور راد لاگو سا، اور آس کا لگا لگا کر، سولہ سولہ سو کا مسوسا، رور کہک کہک سلگ سلگ دھک دھک، ہر گال گورا کھ دھول مل، اس طور کہ

ہا ہا اودھو ہر دوار کا کوسدھار د
کا ہو کہا دوسں سگر دو دوس ہمارو"

(ص ۲۵-۲۶)

اس بیان میں سری کرشن کی زندگی کے بعض واقعات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں ان کی تفصیل طوالت کے خوف سے نظر انداز کی جاتی ہے۔

کے عہد (۱۲۱۲ھ تا ۱۲۲۹ھ / ۱۷۹۸ء تا ۱۸۱۴ء) میں لکھا۔ اس میں ایک شادی کی محفل میں ناچ گانے کا بیان کرتے ہوئے "رہس" کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا ہو۔
انشاؔ نے اپنے شعروں میں بھی جا بجا رہس کی طرف اشارے کیے ہیں۔ مثلاً

سانگ ہولی میں حضور اپنے جو لاویں ہر رات
کہ کنھیا بنیں اور سر پہ وہ دھر لیویں مکٹ
گوپیاں ہو کے پڑی ڈھونڈھیں کدم کی چھایا میں
بانسری دھن میں دکھا دیویں وہ ہو جمنا تٹ

بنی ہوئی کہیں رادھا کہیں کنھیا جی
پیتمبر اوڑھے ہوئے سر پہ رکھے مور مکٹ[۵۱]

سید انشاؔ کے ہم عصر مرزا قتیلؔ نے لکھنؤ میں رہس کے جلسوں کا حال یوں بیان کیا ہو کہ جنم اشٹمی کا دن گزر کر رات کو برہمن لوگ اپنے عزیز لڑکوں کو کنھیا، رادھا اور سکھیاں بنا کر انعام کی امید میں ہندو امیروں کے یہاں لے جا کر اُن کو نچاتے ہیں۔ جب کنھیا اور رادھا محفل میں آتی ہیں تو سب لوگ اُن کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کو بڑی عزت سے لے جا کر مسند پر بٹھاتے ہیں۔ سکھیاں ان کے سامنے ساز کے ساتھ گانا ناچنا شروع کر دیتی ہیں۔ پھر رادھا اور کنھیا میں شکر رنجی ہو جاتی ہو اور رادھا کنھیا سے روٹھ کر الگ جا بیٹھتی ہیں۔ سکھیاں دونوں میں میل کروا کے ناچنے لگتی ہیں۔ صبح ہوتے رادھا اور کنھیا بھی کھڑے ہو کر سکھیوں کے ساتھ ناچ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کنھیا کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی ہوتی ہے۔ وہ ایک گیند زمین پر ڈال دیتا ہے

---

۵۱ - کلیات انشاء

جس کو سکھیاں لے بھاگنا چاہتی ہیں۔ لیکن کنھیا ساز کی آواز اور رقص کے اصول کے ساتھ چھڑی سے گیند کو اس طرح حرکت دیتا رہتا ہو کہ وہ اس کو پکڑ نہیں پاتیں۔

جب رادھا اور کنھیا ناچ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سارا مجمع اُن کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے۔[1]

رہس منڈلیوں میں ایکٹنگ کی کچھ بُری بھلی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ مگر استاد خود بھی اس فن سے بخوبی واقف نہ ہوتے تھے تو اُن کے شاگردوں سے کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ رہس منڈلیوں میں کام کرنے والے ادنیٰ درجے کے اَن پڑھ لڑکے اور اُن کے استاد بھی بالعموم جاہل ہوتے تھے۔ غرض کہ رہس کی ڈرامائی حیثیت رام لیلا سے کچھ بہتر ہونے کے باوجود بہت پست تھی۔

دنیا کی ہر چیز بدلتی رہتی ہے۔ گو مذہبی عقیدت میں تبدیلی بہت مشکل سے اور بہت دیر میں ہوتی ہو۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب اور سب طرح کے ناٹک فنا ہوگئے اس وقت بھی ان مذہبی ناٹکوں کا وجود باقی رہا۔ لیکن مذہبی عقیدت بھی ایک ہی چیز کی تکرار سے آخر کار اکتا ہی جاتی ہو۔ اس لیے رہس منڈلیوں نے یہ طریقہ نکالا کہ شروع میں کرشن کی لیلاؤں میں سے کوئی لیلا مثلاً منہیارن لیلا، ڈھاڑی لیلا، کالی ناگ لیلا، ماکھن چوری، کنس مردن، چیر ہرن وغیرہ دکھا کر گویا رسم پوری کر دی اور اس کے بعد مشہور اور عام پسند قصوں میں سے کوئی مذہبی یا غیر مذہبی قصہ کھیلا، مثلاً ہریش چندر، مورددھوج، پرہلاد، دھرو، دیارام گوجر یا سیاہ پوش کا قصہ یا آلھا اودل کی کوئی داستان۔

ایک طرح کا عام پسند ناٹک اور تھا جس میں جاندار انسان نہیں بلکہ کاٹھ

---

[1] ہفت تماشا ص ۷۵–۷۶

کی بے جان پتلیاں کام کرتی تھیں اور جو کٹھ پتلی کا تماشا کہلاتا تھا۔ یہ تماشا کرنے والے بالعموم خانہ بدوش لوگ ہوتے تھے جو شہر شہر بلکہ گاؤں گاؤں پھرا کرتے تھے۔ یہ سب کھیل ادنیٰ درجے کے سازو سامان کے ساتھ بہت معمولی طور پر دکھائے جاتے تھے اور صرف نیچے طبقے کے اَن پڑھ لوگوں کے لیے تفریح کا سامان بہم پہونچاتے تھے۔ جن لوگوں کا مذاق بلند تھا، اُن کی دل چسپی کا کوئی ذریعہ باقاعدہ ڈرامے کی شکل میں موجود نہ تھا۔

اردو ڈرامے کے وجود میں آنے سے پہلے اودھ میں اونچے طبقوں کے تفریحی مشغلوں میں تین چیزیں ایسی تھیں جن میں ڈرامائی عنصر پائے جاتے تھے، قصہ خوانی یا داستان گوئی، بھانڈوں کی نقلیں، بہروپیوں کے روپ۔

قصہ خوانی یا داستان گوئی قصہ خواں اپنی پوشاک میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے تھے، اپنے چہرے پر کسی طرح کا پینٹ نہیں لگاتے تھے۔ مگر آواز کے اتار چڑھاؤ، لہجے کی تبدیلی، چہرے کے تغیر، آنکھوں کی گردش اور جسم کی حرکتوں سے مختلف نفسیاتی حالتوں کی تصویر کھینچ دیتے تھے، اور مختلف طبقوں کے لوگوں کی تمثیل پیش کر دیتے تھے۔ قصہ خوانی کا فن ہندوستان میں ایران سے آیا تھا۔ اچھے اچھے قابل ادیب اور بلند پایہ شاعر اس فن میں مہارت پیدا کرتے تھے اور بادشاہوں اور امیروں کو خوش کر کے انعام و اکرام حاصل کرتے تھے۔ ایک ایرانی قصہ خواں مُلّا میرزا اسد بیگ اسد شیرازی کے بارے میں تقی اوحدی کا بیان ہے کہ اس کے والد اور چچا مُلّا حیدر اور مولانا فتحی شاہنامہ خوانی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ مُلّا اسد ایک ذی علم شاعر، درست اطوار انسان اور تجرد پسند صوفی تھا۔ جب ایران سے ہندوستان آرہا تھا تو ٹھٹھہ میں میرزا غازی بیگ ترخان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرزا غازی جو ابھی لڑکپن کی منزل میں تھا، بہت تپاک سے پیش آیا تھا اور اس کی صحبت کے

اثر سے اس کی طبیعت اور روش میں بڑی ترقی ہوئی اور خود ملا کو اس سے بہت فائدے ہوئے۔ میرزا غازی کے انتقال کے بعد وہ شہنشاہ جہانگیر کا ملازم ہو گیا۔[۱] جہانگیر اُس کے بارے میں لکھتا ہے :۔

"میرزا غازی کے ملازموں میں سے ملا اسد قصہ خوان نے انھیں دنوں میں ٹھٹھہ سے آکر میری ملازمت کر لی۔ چونکہ وہ پُر نقل اور شیریں حکایت اور خوش بیان تھا، اس کی صحبت مجھے پسند آئی۔ میں نے اس کو محفوظ خاں کا خطاب دے کر خوش کر دیا اور ایک ہزار روپیہ، خلعت، گھوڑا، ہاتھی اور پالکی عنایت کی۔ کچھ دن بعد حکم دیا کہ اس کو روپے سے تولیں۔ چار ہزار چار سو روپے ہوئے۔ اس کو دو صدی ذات و بیست سوار، کے منصب پر سرفراز کیا اور حکم دیا کہ ہمیشہ مجلس گپ، میں حاضر ہوا کرے"[۲]

بعض نیچے درجے کے قصہ خوان میلوں اور بازاروں میں بھی اپنے فن کی نمائش کرتے تھے۔ شمس العلماء آزاد دہلوی نے ایسے ہی قصہ خوانوں کے بارے میں لکھا ہے :۔

"ایران کے بازاروں میں اور اکثر قہوہ خانوں میں ایک شخص نظر آئے گا کہ سر و قد کھڑا داستان کہہ رہا ہے اور لوگوں کا انبوہ اپنے ذوق و شوق میں مست اُسے گھیرے کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ ہر مطلب کو نہایت فصاحت کے ساتھ نظم و نثر سے مرصع کرتا ہے اور صورت ماجرا کو اس تاثیر سے ادا کرتا ہے کہ سماں باندھ دیتا ہے۔ کبھی ہتھیار بھی لگائے ہوتا ہے جنگ کے معرکے یا غصے کے وقت پر شیر کی طرح بپھر جاتا ہے، خوشی کی جگہ اس طرح لگاتا ہے کہ ....

---

[۱]۔ عرفات العاشقین، قلمی، کتب خانۂ مشرقی، پٹنہ، ورق ۱۱۲ (۱)

[۲]۔ توزک جہانگیری، مطبع نول کشور، لکھنؤ، سال طباعت نا معلوم، ص ۱۸۷

سننے والے وجد کرتے ہیں۔ غرضے کہ غیظ و غضب، عیش و طرب، غم و الم کی تصویر اپنے کلام ہی سے نہیں کھینچتا بلکہ خود اُس کی تصویر بن جاتا ہو۔ اُسے درحقیقت بڑا صاحب کمال سمجھنا چاہئے، کیونکہ اکیلا آدمی اُن مختلف کاموں کو پورا پورا ادا کرتا ہو جو کہ تھیٹر میں ایک سنگت کر سکتی ہو۔ ایسے ممثلوں کو قصہ خوان کہتے ہیں۔"[1]

سرورؔ لکھنوی نے لکھنؤ کی بازاروں میں قصہ خوانوں کی موجودگی کا ذکر یوں کیا ہو:۔

"ایک جا قصہ خوان حمزہ و عمرو کی داستان"[2]

"کہیں قصہ خوان فصاحت سے گرم بیان۔ کہیں بزم شاہ اودھ کی حکایت، کہیں کابل کی رزم کی داستان، ایک طرف خسرو شیریں کی روایت، ذکر رستم، فسانۂ سیستان"[3]

قصہ خوان بعد کو داستان گو کہلانے لگے۔ اودھ کے بادشاہوں اور امیروں کے یہاں ذی علم داستان گو ملازم ہوتے تھے۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد [۱۲۴۲ھ – ۱۲۵۳ھ / ۱۸۲۷ء – ۱۸۳۷ء] میں ایک داستان گو غلام مہدی جرنیل اقبال الدولہ قطب الملک محمد عباس مبارز علی خاں بہادر مظفر جنگ کی سرکار میں ملازم تھے۔ انھوں نے اردو کی منتخب غزلوں کا ایک بہت ضخیم مجموعہ تالیف کیا تھا، جس کا قلمی نسخہ خود مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا راقم کے کتب خانے میں موجود ہے[4]۔ لکھنؤ کے مشہور شاعر سید ضامن علی

---

[1] سخندان فارس ص ۱۵۸، [2] فسانۂ عبرت ص ۴۶ [3] فسانۂ عبرت ص ۹۵

[4] اس نسخے کے آخر میں ایک فارسی عبارت ہو، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام "مجموعۂ سخن" اور اس کے اختتام کی تاریخ یکم صفر ۱۲۴۷ھ ہو۔ اس عبارت کے آخر میں مؤلف کا کہا ہوا ایک قطعۂ تاریخ ہے جس سے اُن کی ولادت کا سال ۱۱۸۹ھ نکلتا ہو۔ "مہدی غلام مہدی" مادۂ تاریخ ہو۔ (ادیب)

جلالؔ کے والد حکیم میر اصغر علی[1] ایک ماہر فن داستان گو تھے۔ واجد علی شاہ کی سرکار سے وابستہ ہونے کی بنا پر اپنے نام کے ساتھ "داستان گوے سلطانی" لکھا کرتے تھے۔ بادشاہ نے ان کو داستان سنانے کی زحمت شاید کبھی نہیں دی۔ محض ہنر کی سرپرستی تھی کہ ان کو گھر بیٹھے تنخواہ دیتے رہے۔ ایک مرتبہ مولوی علی حیدر نظم طباطبائی[2] میرزا ذاکر حسین یاس[3] کے ساتھ ان کے یہاں داستان سننے گئے۔ اس کا مختصر ذکر انھیں کی زبان سے سنئے:

"حکیم صاحب نے داستان شروع کر دی ... ... راویان اخبار وناقلان آثار" کے الحان سے محفل گوش بر آواز ہو گئی۔ لیجئے پریوں کا تخت اترا عیش و عشرت کے دور کی تصویر کھنچنے لگی۔

جام زمردیں کا ہو دور انجمن میں
طاؤس ناچتا ہو جس طرح سے چمن میں

دوڑ ساقی کہ مجھے لغزش مستانہ ہے
پاؤں قابو میں نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے

اس کے بعد ہی ایک شاہزادہ فقیروں کا بھیس بدلے، سر بہ صحرا نظر آیا سنسان بیابان، نہ آدمی نہ آدم زاد، بوے عمر انسانات سے دور۔ ریگ تپ رہی ہے، خاک

---

[1] حکیم اصغر علی کی بنائی ہوئی چار داستانیں میری نظر سے گزری ہیں یعنی "داستان ماہ پروین، داستان سیم تن، داستان غزالہ، داستان روشن جمال"۔ پہلی تین داستانیں واجد علی شاہ کی تین مثنویوں کے قصوں پر مبنی ہیں، جن کے نام ترتیب وار بحر الفت، دریاے تعشق اور افسانۂ عشق ہیں۔ ان کی تصنیف کی ہوئی دس داستانیں جن میں یہ چار داستانیں بھی شامل ہیں، رام پور کی رضا لائبریری میں موجود ہیں۔ (ادیب)

[2] اصلاً لکھنوی تھے مگر عمر کا زیادہ حصہ حیدرآباد دکن میں گزرا۔ ذی علم ادیب اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ دیوان غالب کے شارح اور گرے کے انگریزی مرثیے (Gray's Elegy) کے مترجم کی حیثیت سے خاص شہرت پائی (ادیب)

[3] میرزا ذاکر حسین یاس لکھنؤ کے نامور شاعر حضرت آرزو کے والد تھے (ادیب)

اڑ رہی ہو، لو چل رہی ہے، دانہ زمین پر گرتا ہے تو بھن جاتا ہو۔ شاہزادہ ان مصیبتوں کو جھیلتا ہوا اپنی دھن میں چلا جاتا ہے۔ دھوپ اس طرح آنکھیں نکالے ہوئے ہو جس میں ہرن کالے ہوتے ہیں۔ غنیمت یہ ہوا کہ پہاڑ کا ایک درّہ سامنے آیا جیسے آفتاب میں سایہ۔ سایہ کیسا منزلوں ظلمات، بے آب حیات، ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ کئی دن اس تاریک گھر میں اس نے گزار دیے۔ آخر اُکتا گیا، دل الجھنے لگا، جینے سے یاس ہوگئی۔ سمجھا کہ بس یہی درّہ اس کا مقبرہ ہے۔ ایک دن چلتے چلتے معلوم ہوا جگنو سا چمک گیا اور پھر نظر سے اوجھل ہوگیا۔ اب اس نے آگے بڑھ کر، آنکھیں مل کر نظر جما کر دیکھا تو جگنو نہیں، یہ کوئی تارا طلوع کر رہا ہے۔ چلو ایک سیدھ تو مل گئی۔ یہ اسی رُخ پر چلا۔ جوں جوں آگے بڑھتا ہو تارہ بڑا ہوتا جاتا ہے۔ گمان ہوا کہ تارا نہیں، یہ تو آفتاب نکل رہا ہے۔ اور آگے بڑھا تو حال کھلا کہ آفتاب نہیں، درّے کا دوسرا نکاس ہے۔

(سبحان اللہ حکیم صاحب! سحر بیانی اس کو کہتے ہیں۔ یہ مضمون وجد کرنے کے قابل ہو۔ کیا تخیل ہو، کیا حسنِ بیان! آفرین صد آفرین)

اب حکیم صاحب رزم کے میدان میں اُتر آئے۔ مہیب آواز سے دو نعرے کیے کہ...... پھر رجز تو اس طرح ڈانٹ کر پڑھا کہ......

....

اس داستان کی ایک تخیل اور مجھے یاد آگئی۔ لڑائی میں تیروں کا مینھ اس قدر برسا تھا کہ زمین کے رونگٹے کھڑے ہوگئے[1]۔''

امرا رات کو داستان سنتے تھے اور اکثر سنتے سنتے سو جاتے تھے۔ ہمارے شاعر[6] اس بات کی طرف اکثر اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً

---

[1] ادبی دنیا، لاہور، نوروز نمبر ۱۹۳۲ء، ص ۱۰۹-۱۱۰

جب وہ سننے بیٹھتے ہیں آنکھوں میں آتی ہے نیند
کیا اثر رکھتا ہو افسانہ مری تقدیر کا

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

داستان گوئی کے فن نے لکھنؤ میں بہت ترقی کی۔ میں نے اپنے لڑکپن میں یہاں داستان کہنے اور سننے کا شوق بہت عام پایا۔ لیکن اس وقت بھی کوئی ایسا داستان گو موجود نہ تھا جو فی البدیہہ داستان کہتا ہو یا اپنی تصنیف کی ہوئی داستان بیان کرتا ہو۔ آخری باکمال داستان گو، جن پر اس فن کا خاتمہ ہو گیا، دہلی کے میر باقر علی مرحوم تھے خوش قسمتی سے میں نے ان کو ایک مرتبہ فرنگی محل، لکھنؤ میں داستان کہتے سنا۔ خداوند تعالیٰ کے دربار میں خواجہ عمرو کی ایک عیاری انھوں نے اس طرح بیان کی اور لہجے کی تبدیلیوں اور اعضا کی جنبشوں سے وہ کام لیا کہ ساری محفل ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ گئی۔ ان کی زبان کی پاکیزگی اور بیان کی دل کشی تعریف سے مستغنی ہے۔ صرف دو چار فقرے یاد رہ گئے ہیں، سنیے :۔

"مینھ برس کر کھل گیا ہے۔ چھتوں کا پانی ماہی پشت کا جال بناتا ہوا پرنالوں سے بہہ رہا ہے۔

رات کا وقت ہو، بادل چھنٹ چکے ہیں، مطلع صاف ہو گیا ہے۔

وہ نیلا نیلا آسمان، چھٹکے چھٹکے تارے، دھلی دھلی چاندنی کیا سہانا سماں ہے!"

خواجہ دل محمد نے آج سے کوئی پچاس برس پہلے اس بے مثال داستان گو کو لاہور میں ایک تعلیم یافتہ مجمع کے سامنے داستان کہتے دیکھا تھا۔ اس کی کیفیت انھیں کی زبان سے سنیے!۔

۔۔ اسٹیج پر تشریف لائے، کوئی معمولی سی کہانی شروع کی اور چند لمحوں میں محفل کو کشتِ زعفران بنا دیا۔ پھولوں کا ذکر آیا تو بیسیوں بلکہ سیکڑوں قسم کے پھول گن ڈالے۔ ہر کانٹے پر بہار آ گئی۔ ہر شاخ سے گلستاں پھوٹنے لگے۔ طیور کے نام، اُن کے چہچہے، اُن کے قہقہے، اُن کے رنگ، ان کی ادائیں، ان کی بولیاں سن کر امیں بلبل ہزار داستان پر ہر طرف سے داد کے دونگرے برسنے لگے۔ میلے ٹھیلے کا ذکر آیا تو محفل کے سامنے وہ سماں باندھا کہ اپنی تمام جزئیات سمیت آنکھوں کے سامنے ایک تصویر کھنچ گئی۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ غرض کہانی کی کہانی اور زباں دانی کی معجز بیانی۔ کہیں دشت و بیابان کی ویرانی کا نقشہ کھینچا، کہیں بحرِ ذخار میں موجوں کی روانی دکھائی کہیں نجوم کا ذکر آیا تو بارہ برجوں۔ ۔ ۔ میں پھرنے والے سیاروں کے نام، اُن کے منازل، ان کے سعد و نحس کا عمل، سب بیان کر گئے کہیں برکھا رت کا سماں دکھایا، چھت کا ٹپکنا، بوندوں کی جھماجھم، گلی کوچوں میں خشکی اور تری کی جنگ، کیچڑ، پھسلن، بھیگتے بھاگتے مردوں اور عورتوں کی آویزش اور اُن کی بے بسی۔ غرض جو مرقع کھینچا بے مثل، جو نقشہ پیش کیا بے نظیر۔ جنگ کا ذکر چھیڑا تو فنونِ سپہ گری کا کون سا گوشہ تھا جو اُجاگر نہ کیا۔ دربار سجایا تو چہل پہل، زرق برق، آداب تسلیمات، حفظِ مراتب وزرا اور امرا کی آمد، شاہی دبدبہ اور درباری آداب، چوب داروں کی پکار، ۔۔۔

۔۔۔۔۔ لفظوں سے ایسا سماں باندھا کہ تمام کیفیت آنکھوں کے آگے پھر گئی۔ پھر جو شاہی مطبخ کی طرف رُخ کیا تو ستر قسم کے پلاؤ گن ڈالے ۔۔۔ دسترخوان کا سلیقہ، بسم اللہ خوانی کی آواز۔ غرض جو تصویر کھینچی جزئیات سے پُر اور فن کاری کا بہترین نمونہ تھی [۱]

[۱] ماہنامہ آجکل دہلی، نومبر ۱۹۵۶ء، ص ۳۶

اب فنِ داستان گوئی کا کوئی ماہر شاید ہندوستان و پاکستان میں کہیں باقی نہیں ہو۔

بھانڈوں کی نقلیں | بھانڈوں کی نقلیں چھوٹے چھوٹے ہنسانے والے ڈرامے ہوتے ہیں جن کو انگریزی میں فارس (Farce) اور ہندی میں پرہسن کہتے ہیں۔ اکثر نقلوں میں صرف ایک اور کبھی کبھی دو تین ڈرامائی سین ہوتے ہیں۔ لکھنؤ میں میلوں میں، بازاروں میں، جشنوں میں، بڑی بڑی دعوتوں میں اور خوشی کی تمام تقریبوں میں بھانڈ ضرور ہوتے تھے، جو اپنی مضحک نقلوں سے حاضرین کا دل خوش کرتے تھے۔ بھانڈوں کا یہ قول مشہور ہے کہ "محفل ویران جہاں بھانڈ نہ باشد"، شاہی محفلیں بھی بھانڈوں سے خالی نہ ہوتی تھیں۔ اکتوبر ۱۸۲۴ء میں جنرل پیجٹ لکھنؤ آئے۔ اودھ کے بادشاہ غازی الدین حیدر کے یہاں اُن کی دعوت ہوئی۔ اس وقت تفریح کے جو سامان مہیا کیے گئے اُن میں بھانڈوں کی نقلیں بھی تھیں۔ "بہ نقل ہائے عجائب و غرائب نقالان[1] عشرت پرداز، لب ہائے تماشائیاں بہ خندہ باز"[2]۔ اسی بادشاہ نے دسمبر ۱۸۲۵ء میں نورا بھانڈ کو کمخواب کی ایک چپکن عنایت کی۔[3] جولائی ۱۸۳۷ء میں نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے انتقال کے بعد فریدون بخت مرزا منا جان تخت نشین ہوئے تو، "جو جو حاضر تھے ان کی نذریں گزریں، باقی صبح پر موقوف ہیں۔ اللہ والے، نورا بھانڈ کا بیٹا، ناچنے لگا، ہر ایک محو تماشا ہوا"[4]۔ محمد علی شاہ بادشاہ[5] اودھ (۱۲۵۲ھ — ۱۲۵۸ھ / ۱۸۳۷ء — ۱۸۴۲ء) جب حسین آباد کی عمارتیں بنوا چکے تو جلو خانے کے سامنے والے میدان میں روز سہ پہر کو بازار لگنے لگی۔ اس میں بقول سرور، "نقال، بھانڈ، ماجد، امبقہ، کھوسٹ مسخرا پن کرتے ہیں . . . پیٹ کے واسطے ظاہر اپنا

---

۱ بھانڈوں کو نقال بھی کہتے ہیں ۲ وقائع حیدری (قلمی)، ۳ اخبار، جام جہاں نما ۲۸ دسمبر ۱۸۲۵ء
۴ فسانۂ عبرت ص ۲۷

فن کرتے ہیں[1]۔"

بھانڈ تھوڑا بہت ناچ گانا بھی سیکھ لیتے تھے۔ مگر ان کا اصل کام نقالی تھا وہ عوام کو خوش کرنے کے لیے بیہودہ بلکہ فحش نقلیں بھی کرتے تھے، لیکن بیشتر پڑھے لکھے ہوتے تھے اور پاک و صاف زندگی بسر کرتے تھے۔ واجد علی شاہ اس فرقے کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"........ وہ فرقہ بھانڈ اور نقال مشہور رہا۔ ہر چند اس فرقے کو سوائے نقل کو اصل کر کے دکھانے کے نُے سُر میں مطلق تمیز نہیں ہوتی، مگر البتہ جو کام اُن کا ہو یعنی نقل نمائی، وہ انھیں پر ختم ہے، اور اس فرقے کو راقم نے بچشم خود دیکھا کہ ایسے پابند صوم و صلوٰۃ ہوتے ہیں۔ سبحان اللہ۔ ہزار روپے کی تھیلی سامنے دھر دو اور فرمائش کرو کہ نماز فوت ہونے دو، اگر نقل کیے جاؤ گے تو یہ ہزار روپیہ تمھارا ہے، کبھی قبول نہ کریں گے، پر نماز وقت پر بجا لائیں گے[2]۔"

بھانڈ جہاں عوام کو ہنسانے کے لیے ادنیٰ درجے کی ظرافت سے کام لیتے تھے، وہاں اہل علم کی محفلوں میں ایسی نقلیں بھی کرتے تھے جن کے لیے کافی علمی استعداد کی ضرورت ہوتی تھی۔ مثلاً اس طرح کی دو نقلیں یہاں لکھی جاتی ہیں۔ ایک نقل کو بخوبی سمجھنے کے لیے دو باتوں کا ذہن میں رکھنا ضروری ہو۔ ایک یہ کہ بانی محفل کتنے ہی بڑے مرتبے کا آدمی کیوں نہ ہو، اگر اس میں کوئی اخلاقی یا خاندانی یا کسی اور طرح کی کمزوری ہو یا محفل کے انتظام میں کوئی کمی رہ جائے تو بھانڈ ان چیزوں کو اپنی نقلوں کا موضوع ضرور بناتے تھے۔ دوسری یہ کہ اگلے زمانے میں بڑے

---

[1] فسانۂ عبرت ص ۹۶

[2] بنی، مصنفہ واجد علی شاہ ص ۱۲۶-۱۲۷

سے بڑے درجے کے ذی علم لوگ کچھ طالب علموں کو درس[1] دیتے تھے، مگر اس کا کوئی معاوضہ نہ لیتے تھے۔ ان دونوں باتوں کو نظر میں رکھیے اور بھانڈوں کی ایک نقل سُنیے!

فرنگی محل، لکھنؤ کے ایک عالم اودھ کی شاہی کے زمانے میں کسی بہت بڑے عہدے پر فائز تھے۔ وہ عربی کی ایک بہت بلند پایہ اور مشکل کتاب کا درس دینے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مگر عام اصول کے خلاف بلا معاوضہ درس نہ دیتے تھے، بلکہ فی سبق ایک اشرفی لیتے تھے۔ اس لیے صرف امرا کے لڑکے اُن کی تعلیم سے مستفید ہو سکتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کے یا اُن کے کسی عزیز کے یہاں کوئی تقریب ہوئی اور بھانڈ بلائے گئے۔ انھوں نے پہلی ہی نقل یہ کی کہ مسند بچھائی گئی، گاؤ تکیہ لگایا گیا اور ایک بھانڈ انھیں عالم صاحب کی وضع قطع بنا کر آیا اور مسند پر گاؤ سے لگ کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر کے بعد ایک نوجوان طالب علم بغل میں کتاب دبائے حاضر ہوا اور ان مصنوعی عالم کو سلام کر کے سامنے مؤدب بیٹھ گیا۔ عالم صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔ اس نے عرض کیا کہ میں فلاں کتاب پڑھنا چاہتا ہوں۔ اگر حضور اپنے فیض تعلیم سے مستفیض فرمائیں تو میں تمام عمر حضور کا احسان مند رہوں گا۔ عالم صاحب نے پُرغرور انداز میں فرمایا کہ یہ ہو تو سکتا ہے کہ مگر تم کو فی سبق دو اشرفیاں دینا ہوں گی۔ طالب علم کو یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی اور بولا حضور نے یہ کیا فرمایا! بھلا کوئی بڑا آدمی پڑھانے

---

[1] میرے لڑکپن تک بعض نہایت معزز و محترم، ذی علم و صاحب ثروت بزرگ اس طریقے پر عامل تھے اور میں نے دس گیارہ برس کے سن میں ایسے دو بزرگوں کی تعلیم سے فیض پایا ہے۔ اناؤ میں چودھری سید محمد ماہ صاحب اعلی اللہ مقامہ، تعلقدار اناؤ سے جامع عباسی کے بعض حصے پڑھے اور نیوتنی ضلع اناؤ میں مولوی محمد حسن صاحب مرحوم صدر اعلیٰ اللہ سے عربی کی ایک ابتدائی کتاب پڑھی۔ ادیب

کی اجرت لیتا ہی؟ ۔ عالم صاحب نے کہا کیوں نہیں ۔ آخر مولوی فلاں صاحب لیتے ہیں کہ نہیں ؟ ۔ طالب علم بولا جی ہاں ، وہ ایک دنیا سے نرالی بات کرتے ہیں ۔ مگر وہ بھی فی سبق ایک اشرفی لیتے ہیں اور آپ نے تو فی سبق دو اشرفی معاوضہ قرار دیا ۔ عالم صاحب نے فرمایا کہ بھئی میرا ایک سبق ان کے دو سبقوں کے برابر ہوتا ہے ، اس لیے میں ان سے دونا معاوضہ بھی لیتا ہوں ۔ کچھ دیر اسی طرح بھاؤ تاؤ کے بعد معاملہ طے ہو گیا ۔ طالب علم نے دو اشرفیاں نذر کر کے کتاب کھولی اور ایک مشکل مقام نکال کر پڑھنا شروع کیا عالم صاحب نے اس کا مطلب سمجھانے کے لیے ایسی ایسی موشگافیاں کیں اور ایسے ایسے علمی نکات بیان کیے کہ سب اہل علم حیرت آمیز دلچسپی سے یہ درس و تدریس کا منظر دیکھنے میں محو ہو گئے ۔ اور وہ اصلی عالم اپنے الفاظ اور اپنا لب و لہجہ سن کر اس قدر متعجب ہوئے کہ آخر ضبط نہ کر سکے ۔ اٹھ کر نقلی عالم کے پاس آئے اور پوچھا کہ تو نے یہ کتاب کس سے پڑھی اور تجھ کو اس کا پڑھانا کہاں سے آگیا ۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کہ فلاں زمانے میں ایک نواب زادہ حضور سے پڑھنے آیا کرتا تھا وہ یہی خادم تھا ۔ بھلا حضور ایک بھانڈ کے لڑکے کو کیا پڑھاتے ، اس لیے مجبوراً غلام کو نواب زادہ بننا پڑا ۔

اب دوسری نقل بیان کرنے سے پہلے یہ تمہید سن لیجیے کہ میر محمد باقر داماد ایران میں ایک بہت بڑے عالم اور فلسفی گزرے ہیں ۔ ان کی کتاب افق المبین فلسفے کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل ہے اور اس کے مطالب کا سمجھنا بڑے بڑے فاضلوں کے بس کی بات نہیں ہو ۔ اس تمہید کے بعد نقل سنیے ۔

ایک محفل میں اہل علم کا مجمع تھا ۔ بھانڈوں نے یہ نقل کی کہ ایک شخص میر باقر داماد بن گیا اور مر گیا ۔ جنازہ قبر میں اتارا گیا ۔ منکر نکیر آئے اور حسب معمول سوال کیا ” مَن رَّبُّک “ یعنی تیرا رب کون ہی ؟ میت نے جواب دیا ”ھُوَ الْمُتَّقِی

فَوْقَ الْاُسْطُقُسَّات“ یعنی وہ ایک عنصر ہے جو تمام عناصر سے بالاتر ہے۔ اس جواب کا مطلب فرشتوں کی سمجھ میں نہیں آیا۔ انھوں نے ایک دوسرے کا منھ دیکھا اور پھر وہی سوال کیا میت نے پھر وہی جواب دیا۔ فرشتوں کی سمجھ میں پھر کچھ نہ آیا۔ خیال ہوا کہ شاید یہ ہمارا سوال نہیں سمجھتا۔ اس مرتبہ بہت آہستگی میں کہا کہ حضرت ہمارے سوال کو سمجھ کر اس کا جواب دیجیے۔ ہم پوچھتے ہیں۔ ”مَنْ رَبُّكَ“ میت نے کہا کہ اسی سوال کا تو ہم جواب دیتے ہیں کہ ”ھُوَ الْاُسْطُقُسُّ فَوْقَ الْاُسْطُقُسَّات“ فرشتوں نے کہا حضرت یہ بات تو ہماری سمجھ میں نہیں آتی، ذرا آسان لفظوں میں کہیے۔ میت نے کہا اس سے زیادہ آسان الفاظ اور کیا ہوں گے۔ اب فرشتوں نے عاجز آکر یہ طے کیا کہ چلو اللہ میاں کے پاس چل کر اپنی یہ مشکل آسان کریں۔ ایک بھانڈ فوراً اللہ میاں بن گیا۔ منکر نکیر آئے اور اللہ میاں سے عرض کیا کہ جب سے دنیا قائم ہوئی ہے ہم بے شمار قبروں میں جا کر یہ سوال پوچھ چکے ہیں۔ ”مَنْ رَبُّكَ“ اور اس کے جتنے جواب دیے گئے ہیں وہ سب ہماری سمجھ میں آگئے۔ آج ایک ایسے شخص سے سابقہ پڑ گیا ہے جس کا جواب کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اللہ میاں نے کہا ذرا وہ جواب ہمیں بھی تو سنواؤ۔ فرشتوں نے کہا وہ کہتا ہے ”ھُوَ الْاُسْطُقُسُّ فَوْقَ الْاُسْطُقُسَّات“ اللہ میاں بولے ”آہا معلوم ہوتا ہے تم میر باقر داماد کی قبر میں چلے گئے“ اور وہ افق المبین چیز ہائے نوشتہ کہ من هم نہ فہمیدم“۔ یہ سن کر ساری محفل بے اختیار ہنسنے لگی۔

بھگتیے، یا بھگت باز، ہمارے پرانے قصوں اور مثنویوں میں بھانڈوں کے ساتھ بھگتیوں کا ذکر بھی اکثر آتا ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں بھگت کے معنی یہ بتائے گئے ہیں۔

”ہندوؤں کا ایک مذہبی سوانگ جس میں نرسنگھ اوتار اور کرشن وغیرہ کا روپ بھرتے ہیں“

بھگت کھیلنے والے کو ”بھگتیا“ اور ”بھگت باز“ کہتے تھے۔ اسی فرہنگ میں بھگت باز“

کے یہ معنی لکھے گئے ہیں:۔

"ہندوؤں کا وہ فرقہ جو لڑکوں کو نچاتا اور سوانگ وغیرہ بھر کر تماشا دکھاتا ہے۔"

لیکن "بھگت" اور "بھگت باز" کے ساتھ یہ ہندوؤں کی تخصیص صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ بھگت بازوں کے بارے میں سب سے قدیم اور سب سے زیادہ تفصیلی بیان پنجاب کے مشہور شاعر مولانا محمد اکرم غنیمت کی مثنوی نیرنگ عشق میں ملتا ہے، جو ۱۰۹۶ھ کی تصنیف ہے[1]۔ اس میں بھگت بازوں کی ایک جماعت کا بیان یوں کیا گیا ہے:۔

"مقلد پیشگاں با طرز و انداز — مشعبد سیرتاں با نغمہ و ساز
بہ علم رقص و تقلید اوستاداں — مراد خاطر عشرت نژاداں
ہمہ خوش لہجگان نغمہ پرداز — بہ حرف اصطلاح ما بھگت باز
بہ فن خویشتن استاد ہر یک — گہے مرد و گہے زن گاہ مردک
گہے سناسیان مو پریشاں — گہے اسلامیان اہل ایماں
گہے در غربت و گاہے بہ شنگی — گہے کشمیری و گاہے فرنگی
گہے دہقاں زن و گہ پیر دہقاں — گہے گبر و گہ ترسا و مسلماں
قزلباشانہ گہ امرد خریدار — غلامے گہ چو طوطی چرب گفتار
گہے رنگ زن نو زادہ بر رو — بہ دست دایہ گریاں زادۂ او
گہے دیوانہ و گاہے پری بود — کلامش را شنیدن باوری بود

---

[1] خاتمۂ کتاب میں مصنف کہتا ہے۔

"چو شد ختم ایں کلام سینہ پرورد — خرد تکلیف تاریخش ہمی کرد
نمایاں گشت تاریخ نو آئین — ز گلزار بہار فکر رنگین"
۱۰۹۶ھ

ز ہر قومے کہ خواہی جلوہ سازند　　بہ ہر رنگے کہ گوئی عشوہ بازند[1]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بھگت باز موسیقی، رقص اور تقلید کے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ کبھی مرد بن جاتے تھے، کبھی عورت، کبھی جٹادھاری سنیاسی، کبھی مسلمان ملّا، کبھی غریب، کبھی شوخ، کبھی کشمیری، کبھی فرنگی، کبھی دہاتی عورت، کبھی بوڑھا کسان کبھی بے ریش مجوسی، کبھی امرد پرست عیاش، کبھی چرب زبان لڑکا، کبھی نئی نویلی زچہ، کبھی دیوانہ، کبھی پری، غرض وہ ہر طبقے کی نقل اتار لیتے تھے اور طرح طرح سے عشوہ بازی کرتے تھے۔

بھگت بازوں کی اس جماعت نے ایک مفلس فقیر کے حسین لڑکے شاہد کو بہت سا روپیہ دے کر اپنی سنگت میں لے لیا اور اس کو اپنے فن کی تعلیم دے کر شہر بشہر لیے لیے پھرے۔[2]

بارھویں صدی ہجری کے وسط میں دہلی کے بھگت بازوں میں تقی سب سے زیادہ ممتاز تھا۔ اس پر بادشاہ کی نظرِ عنایت تھی۔ بڑے بڑے امیر اس کو عزت سے بلاتے اور اس کی صحبت کے خواہاں رہتے تھے۔ بھگت کے سامان میں ہر دیار اور ہر فرقے کے رواج کے مطابق لباس اور ہتھیار اس کے یہاں موجود تھے اور حسین و جمیل لڑکے اس کے اکھاڑے میں حاضر رہتے تھے۔ اسی زمانے میں شاہ دانیال عرف سرخی (؟) نقالی اور لطیفہ گوئی میں بے مثل تھا۔ کئی زبانوں میں بلبل کی طرح چہکتا تھا اور موسیقی میں مہارت رکھتا تھا۔ خواصی اور رانو بھٹا دہلی کے نامی نقالوں میں تھے اور بادشاہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ نو ایجاد نقلیں بیان کرنے میں وہ بے نظیر تھے اور ان کے گانے اور ناچنے میں ایک خاص کیفیت تھی۔ یاری نقال نہایت خوبصورت تھا اور

---

[1] نیرنگ عشق صـ ۱۶-۱۷　[2] نیرنگ عشق صـ ۱۴

اس کے طائفے کے کل نقال بہت "خوش مضمون" تھے۔[1]

اوپر کے بیان سے نقال اور مقلد یعنی بھانڈ اور بھگتیے کا فرق یہ نکلتا ہو: نقالوں یا بھانڈوں کا کام زبان سے نقلیں یا لطیفے بیان کرنا تھا اور بھگتیوں یا بھگت بازوں کا کام کسی کا بھیس بنا کے اُن کے افعال و حرکات کی تمثیل پیش کرنا تھا۔ ناچ گانا دونوں میں مشترک تھا۔ بعد کو یہ فرق باقی نہیں رہا۔ نقالی اور بھگت بازی ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں اور "بھگتیا" اور "بھگت باز" کے الفاظ رفتہ رفتہ متروک ہو گئے

بہروپئے | بہروپئے طرح طرح کے روپ بھر کر نقل کو اصل دکھانے میں بڑا کمال رکھتے تھے۔ یہ فن بھی ہندوستان میں بہت مدت سے چلا آ رہا ہو۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے شہنشاہ ہمایوں کے عہد کا ایک آنکھوں دیکھا واقعہ یوں بیان کیا ہے:-

"۹۸۵ھ میں ایک دن مشہور ایرانی شاعر حیدر تونی کا بیٹا ابن حیدر، جو بڑا ڈرپوک تھا۔ ہمایوں کے دربار میں حاضر تھا اور جہاز پر بیٹھنے سے جتنا خوف اس کو معلوم ہوا تھا اس کی کیفیت بیان کر رہا تھا۔ اس وقت بھی خوف کے آثار اس پر طاری تھے۔ میں نے پوچھا کہ تم تو شاید حج کے لیے سفر کر کے پچھتائے ہو گے۔ وہ بولا ہاں۔ بادشاہ نے فرمایا یہ کعبے کے سفر سے کیا پشیمان ہوئے ہوں گے، ہاں جہاز پر بیٹھ کے پچھتائے ہوں گے۔ اسی اثناء میں بادشاہ کے اشارہ سے۔ مقلد شیریں کار، مٹھے خاں ایسے شخص

---

[1] مرقع دہلی ص ۶۴، ۶۷۔ حیدر آباد کے نواب ذوالقدر خان دوران درگاہ قلی خاں مؤتمن الدولہ سالار جنگ بہادر، آخر ربیع الاول ۱۱۵۱ھ سے ۲۰ جمادی الاول ۱۱۵۴ھ تک تین برس دو مہینے دہلی میں رہے اور وہاں کے چشم دید حالات ایک کتاب میں لکھے جو مرقع دہلی کے نام سے حکیم سید مظفر حسین کے طولانی مقدمہ کے ساتھ تاج پریس، حیدر آباد، دکن میں چھپ کر شائع ہوئی۔

کی صورت بنا کے جو کتے کے کاٹنے سے پاگل ہو گیا ہو، کتے کی طرح بھونکتا ہوا آیا اور ابن حیدر کو پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ اس طرح بدحواس ہو کر بھاگا کہ پگڑی کہیں گئی اور جوتا کہیں گیا، آخر ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ سب لوگ بہت ہنسے جب اس کو حقیقت حال معلوم ہوئی تو وہ بہت شرمندہ ہوا اور بادشاہ نے اس کو تسلی دی۔[۱]"

اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ نے اپنے زمانۂ ولی عہدی کے ایک بہروپیے کا ذکر یوں کیا ہے کہ ایک دن میرے چند مصاحب حاضر تھے اور دلچسپ حکایتوں اور رنگین لطیفوں سے میرا دل خوش کر رہے تھے۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ ان کی وفاداری کا امتحان کروں۔ چنانچہ میرے ایماء سے ایک بہروپیا زخمی آدمی کی صورت بن کر، جسم سے خون بہتا ہوا، ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے زینہ سے اترا اور مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے بھی بہت اضطراب ظاہر کیا۔ یہ دیکھ کر ایک مصاحب نے اٹھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک نے جھپٹ کر اس کی کمر پکڑ لی اور چاہا کہ اس کی تلوار سے اس کا کام تمام کر دیں۔ وہ فریاد کرنے لگا کہ میں بہروپیا ہوں۔ میں نے بھی ان لوگوں کو روکا۔ اس طرح اس کی جان بچی، مگر چوٹ بہت آگئی۔ میں نے بہروپیے کو انعام دے کر نوکر رکھ لیا اور مصاحبوں کو پانچ پانچ سو روپے اور ایک ایک تلوار، ڈھال، بندوق اور سات فیر کا تمنچہ مرحمت کر کے مصاحبان اور جوانان بہرہ خطاب دیا اور اپنے پلنگ کے پہرے کی خدمت سپرد کر کے اُن کو عزت بخشی۔[۲]

میں نے بہروپیوں کو طرح طرح کے روپ بھرتے دیکھا ہے مگر ایک باکمال بہروپیے کے تین روپ قابل ذکر ہیں۔ ایک سو برس کی پیرانہ سال بڑھیا کا روپ۔ چہرے پر جھریاں

۱؎ منتخب التواریخ صفحہ ۱۳۰ ۲؎ محل خانۂ شاہی صفحہ ۷۸۔

پڑی ہوئی، گردن ہلتی ہوئی، ہاتھوں میں رعشہ، پیر لڑکھڑاتے ہوئے آواز میں تھرتھری، ایک بڑھیا ٹیکتی چلی آرہی ہے۔ دوسرا آدھا انگی کا روپ ہے سر سے پیر تک آدھا جسم مرد کا اور آدھا عورت کا، ایک چادر اس انداز سے اوڑھے ہوئے کہ ایک ذرا سی جنبش میں وہ ایک طرف ہٹ گئی اور سامنے ایک مرد مردانے لباس میں کھڑا ہوا نظر آیا، اور پھر ذرا سی جنبش میں وہ چادر دوسری طرف ہٹ گئی اور ایک خوبصورت عورت زنانی پوشاک پہنے، زیوروں سے آراستہ نظر کے سامنے آگئی۔ تیسرا نکٹے سپاہی کا روپ۔ اگلے زمانے کا ایک شمشیر باز ڈھال تلوار لگائے، منہنی آواز سے بولتا ہوا ایک لڑائی کا حال بیان کر رہا ہے، جس میں حریف کی تلوار نے اس کی ناک صاف کر دی تھی۔ معلوم نہیں اچھی بھلی ناک کو اس نے کیوں کر غائب کر دیا۔

بعض بہروپیے جانوروں کا روپ بھرنے کی مشق کرتے تھے۔ ایک معتبر راوی نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ ایک رئیس کے یہاں چند احباب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک بڑا سا لنگور دُم اٹھائے اچھلتا کودتا سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ سب لوگ ڈر کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب لنگور نے کھڑے ہو کر سلام کیا اور انعام مانگا تب یہ حقیقت کھلی کہ وہ بہروپیا تھا۔ سب لوگ اس کے کمال کے قائل ہو گئے اور سب نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس کو انعام دیا۔

داستان گوئی، نقالی اور بہروپ کی ڈرامائی حیثیت

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہو اونچے طبقوں کے تفریحی سامان میں داستان گوئی، نقالی اور بہروپ بھی تین چیزیں ایسی تھیں جن میں ڈرامائی عناصر کم و بیش پائے جاتے تھے۔ داستان گو زیادہ تر صرف لہجے کی تبدیلی سے اور کبھی کبھی جسم کی جنبش سے بھی کام لیتے تھے زیادہ حرکت کرنا، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا داستان گو کے فن سے باہر تھا۔ نقال سب طرح کی

حرکتیں کرتے تھے۔ ان کا فن کسی واقعے کو بیان کرنا نہیں بلکہ اس کو کر کے دکھانا تھا
بہروپیوں کا کام صرف بھیس بدلنا تھا کسی واقعے کو پیش کرنا نہ تھا۔ داستان گو نہ
اپنے چہرے کو بدلتے تھے نہ لباس کو۔ نقّال حسب ضرورت اپنے لباس میں تھوڑی سی
تبدیلی کر لیتے تھے اور چہرے کو بھی کبھی کبھی رنگ لیتے تھے اور کبھی مصنوعی داڑھی
مونچھیں بھی لگا لیتے تھے۔ بہروپیے جس کا بھیس بناتے تھے اس کی پوری نقل اتارتے
تھے۔ لباس، چہرہ، آواز، چال سب اسی کی بنا لیتے تھے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھے
کہ داستان گو اگر کسی عورت کو پیش کرے گا تو صرف اپنی آواز میں نرمی اور نزاکت پیدا
کرے گا، نقّال اس موقعہ پر صرف دوپٹا اوڑھ لینا کافی سمجھے گا، اور بہروپیا اسی
مقصد کے لیے داڑھی مونچھیں صاف کروائے گا، چہرے پر غازہ، دانتوں میں
مسّی، آنکھوں میں سُرمہ لگائے گا۔ سر سے پیر تک زنانی پوشاک پہنے گا، اور ہر طرح
کے زیور سے اپنے کو آراستہ کر کے بالکل ایک عورت بن جائے گا۔ ایک بات اور
ہے۔ داستان گو اور بہروپیے اپنا اپنا کام انفرادی طور پر انجام دیتے ہیں۔ لیکن
نقّالوں کی پوری سنگت ہوتی ہو اور کئی کئی آدمی مل کر کسی واقعے کو پیش کرتے ہیں۔
اس سے صاف ظاہر ہو کہ ڈرامے اور ایکٹنگ کے نقطۂ نظر سے نقّالی کو داستان
گوئی اور بہروپ پر فوقیت حاصل تھی۔ مگر نقّال صرف بہت چھوٹے چھوٹے اور محض
ہنسنے ہنسانے والے واقعات دکھاتے تھے۔ کوئی مسلسل واقعہ جس کا آغاز، ارتقا،
اور انجام تماشائیوں کے سامنے آجائے، پیش نہیں کرتے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو
رہس کی ڈرامائی حیثیت بہت پست ہونے کے باوجود نقّالی سے بہتر تھی۔

شاہی ڈرامے کے ابتدائی آثار

ایک طولانی مدت تک ناٹک اسی پستی کی حالت میں پڑا رہا۔ نصیر الدین حیدر بادشاہِ اودھ (۱۲۴۳ھ تا ۱۲۵۳ھ / ۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء) کے عہد میں پہلے پہل اس کے آثار نظر آتے ہیں، کہ ناٹک جو راج بھون سے نکل کر سڑکوں اور میدانوں میں مارا مارا پھر رہا تھا، پھر شاہی محل کی طرف جا رہا ہو۔ یہ نوجوان بادشاہ ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو تخت پر بیٹھا اور کچھ کم دس برس سلطنت کر کے، ۷ جولائی ۱۸۳۷ء کو اپنے محل کے اندر مار ڈالا گیا۔ وہ بڑا نفیس مزاج، رنگین طبع، عیش پسند اور حُسن پرست تھا۔ ناچ گانے اور کھیل تماشے کا بہت شوق رکھتا تھا۔ اس کے محل میں گانے ناچنے والیوں کی بڑی کثرت تھی۔ ان کے علاوہ کثیر تعداد ایسی عورتوں کی تھی جو "جلسے والیاں" کہلاتی تھیں۔

جلسے والیاں | مرآۃ الاوضاع کے مصنف لال جی کا بیان ہے:۔

"صد ہا زن در مصاحبت آں حضرت بنام جلسے والی و گائن و الضرام دگر خدمات نوکر شدند"[1]

تاریخ اقتداریہ کے مصنف اقتدار الدولہ لکھتے ہیں:۔

"ہزار بارہ سے جلسے والیاں، دُر در گوش، مرصّع پوش ملازم

---

[1] مرآۃ الاوضاع ورق ۲۲ب

تھیں۔ اور سنا ہو کہ جب جلسہ ہوتا تھا تو اس کا یہ طریق تھا کہ زرد پوشوں کی ایک قطار، اور سرخ پوشوں کی جدا قطار ہو اور سبز پوشوں کی جدا قطار ہو اور بیچ میں میز لگی ہو۔ اس پر جام اور گلابیاں ہر رنگ کی شراب کی رکھی ہیں اور ہر طرح کی شے میز پر چُنی ہو اور یہ سب ہزار بارہ سے نازنین مہ جبیں حاضر ہیں اور ناچ ہو رہا ہو اور پیالۂ مئے گردش میں ہے۔ حقیقت میں ایک پرستان کا عالم ہو رہا ہے"[1]

رجب علی بیگ سرور فسانۂ عجائب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"ہزار بارہ سے جلسے والی، حور وش، برق کردار، کبک رفتار، نغز گفتار، از پا تا فرق دریائے جواہر میں غرق، دست بستہ دربرو کھڑی رہی۔ جہان کی نعمت سامنے پڑی رہی .... ہر وقت راجا اندر کا جلسہ رہا۔ نہروں میں عطر بہا۔ مکان اس طرح کے بنوائے کہ فلک گرداں نے صدقے ہو کر چکر کھائے۔ اندر اس گلشن ارم کہ ایسا باغ اور اس طرح کی کوٹھی چشم و گوش عالم نے دیکھی نہ سُنی .... اندر اس میں عطر کا حوض چھلکتا رہا۔ تمام شہر مہکتا رہا"[2]

سرور نے اپنی دوسری کتاب "فسانۂ عبرت" میں اس بادشاہ کی عیش پسندی کی داستان تفصیل سے بیان کی ہو۔ یہاں وہ داستان بیچ بیچ سے غیر ضروری ٹکڑے نکال کر انھیں کے لفظوں میں پیش کی جاتی ہے:۔

"پچیس برس کا سن عین شباب .... کے دن تھے جو تاج و تخت بہ صد بخت ہاتھ آیا۔ زیست کی کیفیت، حکومت کا لطف خوب اٹھایا جلسہ وہ ہر وقت پیش نظر رہا جو محمد شاہ کو خواب میں میسر نہ آیا۔ ہزار ہا

۱؎ تاریخ اقتداریہ قلمی، ص ۱۷۵ ۲؎ فسانۂ عجائب ص ۱۲

پری پیکر، حور وش .... صبح و شام در زمرۂ خدام
دست بستہ حاضر رہیں۔ گلاب کیوڑا کیا چیز ہے، عطر کی نہریں بہیں...
...... پھولوں کا وہ صرف تھا کہ دیکھا نہ سنا۔ ہزارہا باغ سرکاری
عجیب روش غریب تیاری کے تھے۔ اس پر کئی سے روپے روز کے بازار
سے آتے تھے۔ صبح کو فراشنیاں باسی ہار پھول جو پھینکتی تھیں چاندی
کے ڈھیر[۵۱] ان کے ہاتھ لگ جاتے تھے ....

"جلسے والیاں نادرِ زمانہ، شہرۂ آفاق، گائنیں پری چہرہ،
موسیقی میں یکتا، دلبری میں طاق، ان کے علاوہ ہزاروں مہ سیما، رشکِ مہر
کم سن،... کہاریاں پریوں کی صورت کی ....

سو طائفہ شہر کا چیدہ اور سو دہات کا پسندیدہ نوکر تھا۔ پہر دن رہے یہ
سب حاضر ہوتے تھے۔ پچیس پچیس طائفے نے ایک رنگ کے جوڑے عنایت
سرکار، باغ و بہار پہنے اور اسی میل کے گہنے۔ معلوم ہوتا تھا کہ چمن والا
ہے .... اور بھان متی، چونے والیاں، ڈومنیاں، نٹنیاں
حسین، سج دھج کی نرالیاں، قوال، بین کار، ربابیے، سرودیے،
یہاں تک کہ ریچھ والے قلندر، بکرا اور بندر رکھی ہوتا ہے۔

"کمرے[۵۲] میں سامانِ عیش تیار، انگریزی میز ایک سے ایک تحفہ
نادر روزگار، سبز سرخ کاشانی مخمل سے منڈھی، اگر بھر کی جھالر نقرئی،
طلائی بادلے کی ٹنکتی، جہاں تک سیاحِ نگاہ جائے گلدستوں کا...

---

۵۱ پھولوں کے ہاروں اور زیوروں میں چاندی کے تار بہت لگائے جاتے تھے۔

۵۲ کھانا کھانے کا بڑا کمرہ، ڈائننگ ہال۔

چمن نظر آئے۔ اُن کے گرد گزک بادۂ ارغوانی و گلنار و زمرد فام کے چینے، ترتیب گزک کا سامان، جہان کے فواکہ اور طشتریوں میں پستے بادام بھنے۔ متصل اس کے سب نعمت غیر مترقب۔ پلاؤ ہر طرح کے، دو پیازے متعدد طرح دار پکوانہ حساب سے باہر، بورانی، بھرتے، اچار۔ ہر گلدستے کے تلے اتنا سامان کہ ہاتھ بڑھانے کی نوبت نہ آئے۔ جس چیز کی خواہش ہو وہیں پلئے۔ کمرہ دولھن کی صورت سجا............ فرش سے تا سقف و جدار آئینہ بندی ....

" ادھر خود بدولت رونق افروز ہوئے اُدھر پریوں کا گانا ناچ ہونے لگا۔ کمرے کے باہر انگریزی باجے بجنے لگے، قوال، بین کار اپنے ساز ملا بجنے لگے۔ جو جو جس کام کا حاضر تھا، اپنے شغل میں مشغول ہوا۔ خود بدولت اکل و شرب کی طرف متوجہ ہوئے۔ کسی سے آنکھ نہ ملاتے تھے۔ آئینوں میں ایک آئین سے سب کے لطف نظر آتے تھے ....
ایک ایک دن میں ہزار ہزار جوڑے مغرق اور پانچ پانچ سے جوڑی کرہ[1] جواہر نگار عنایت ہوئے۔"

نصیر الدین حیدر کی وفات کا ذکر کرنے کے بعد سرور لکھتے ہیں:۔

" ایک دم میں نہ وہ جلسے نہ چہچہے نہ کوئی گائن نہ جلسے والی نظر آئی"[2]

مرقع خسروی کے مصنف محمد عظمت علی نامی نصیر الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں موجود تھے۔ انھوں نے اس بادشاہ کی نفیس مزاجی اور عیش پسندی کے بیان میں بہت کچھ وہی لکھا ہے جو آپ سرور کی زبان سے ابھی سن چکے ہیں۔ اس بیان کے دو مختصر ٹکڑے

---

[1] فسانۂ عبرت، ص ۱۲ [2] فسانۂ عبرت ص ۱۹

یہاں نقل کیے جاتے ہیں :۔

"عالی دماغی کی وجہ سے گلاب و کیوڑے سے خس کی ٹٹیاں چھڑکی جاتیاں[1]"

"سترہ سو جلسے والیاں نادرۂ زمانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ملازم ہوئیاں اور بارہ سو گائین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فن موسیقی میں یکتا ۔ ۔ ۔ باریاں بھرتیاں[2]"

یہی مصنف ایک جگہ لکھتا ہے :۔

"گیارہ سو اسامیاں صرف جلسے والیاں اور ڈولی والیاں عیش محل کی تھیں[3]"

اور نواب قدسیہ محل کی سخاوت کے سلسلے میں کہتا ہے :۔

"ایک ایک دن میں لاکھ لاکھ روپے جلسے والیوں کو اُس نے دیے[5]"

اس کے علاوہ اور کئی جگہ جلسے والیوں کا ذکر ہے ۔

سرور اور ناسخ دونوں کے بیانوں میں ایک بات غور کے قابل ہے۔ یہ دونوں گائنوں اور جلسے والیوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی وجہ امتیاز موجود تھی ۔ واجد علی شاہ کے بعض بیانوں سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب عشق نامہ میں بعض عورتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ نصیر الدین حیدر بہادر کے یہاں گانے والیوں میں نوکر تھیں[6] اور

---

[1] مرقع خسروی ورق ۸۰ ب [2] مرقع خسروی ورق ۸۰ ب [3] مرقع خسروی ورق ۱۱۰ الف

[4] نصیر الدین حیدر بہادر کی ایک محل کا نام [5] مرقع خسروی ورق ۹۷ ب

[6] محل خانہ شاہی صفحات ۸۸ و ۱۱۰ و ۱۱۷

ایک کے لیے لکھا ہو کہ وہ جلسے والیوں میں نوکر تھی[1]۔

لفظ "جلسہ" کا مفہوم اس زمانے میں "جلسہ" کا لفظ بالعموم ناچ گانے کی محفل کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن ناٹک کا کھیل بھی "جلسہ" کہلاتا تھا۔ واجد علی شاہ کے یہاں جب پہلے پہل رہس کھیلا گیا ہے تو اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"حقیقت میں ایسا جلسہ میں نے کبھی نہیں دیکھا"۔ "یہ جلسہ صبح کو نہیں ہوتا، شام کے وقت ہوتا ہو"۔ "جب یہ جلسہ تیار ہوا تھا تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا اسکندر حشمت بہادر کو بھی تکلیف دی تھی[2]"۔

امانت لکھنوی اپنے ناٹک اندر سبھا کے کھیل کے متعلق لکھتے ہیں۔

"دو شخص اس جلسے کی تیاری پر آمادہ ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ڈیڑھ برس میں جلسہ تیار ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ شہر میں چاروں طرف یہ جلسہ ہوتا ہو[3]"۔

ناٹک کے کھیل کو تو جلسہ کہتے ہی تھے، ناٹک کا لکھا ہوا قصہ بھی جلسہ کہلاتا تھا۔ امانت لکھتے ہیں:۔

"ایسا کوئی جلسہ رہس کے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہئے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہوئے"۔

"یہ جلسہ کہ سب کو مرغوب تھا، مگر اپنے نزدیک معیوب تھا"۔

"اندر سبھا اس جلسے کا نام رکھ کر بجائے چہار باب چار پریاں قرار دے کر شروع کیا[4]"۔

جب ان سب باتوں پر نظر کی جاتی ہو تو قیاس کہتا ہے کہ نصیر الدین حیدر کے محل میں

---

[1] محل خانۂ شاہی صہ ۱۴۱ [2] محل خانۂ شاہی صہ ۱۱۱

[3] شرح اندر سبھا۔ امانت [4] شرح اندر سبھا۔ امانت

ہر طرح کے کھیل تماشوں کے ساتھ ناٹک کے جلسے بھی ہوتے ہوں گے اور جلسے والیاں ان میں کام کرتی ہوں گی۔ لیکن کوئی ایسا بیان نہ مل سکا جس سے اس قیاس کی تصدیق ہو جاتی یا جلسے والیوں کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔ سرور ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ادھر جلسے والیاں، پری زاد گائنیں، اُن کی لاؤ بالیاں تھیں۔ کسی کے ہاتھ میں کنٹر، کسی کے پاس سنہرے گلاس الماس تراش، بید مشک کے شیشے، مرصع کار گلاب پاش، یا شراب پرتگالی سے چھلکتی جواہر نگار پیالیاں لئے۔ کوئی غوری کی قاب میں گزک کو کباب لیے، کسی گلفام پاس پستہ و بادام رہتا تھا، دیکھنے والوں کا دل لیتا تھا، خواب و خور حرام رہتا تھا۔ نائے و نوش، رقص و سرود، نغمہ سرائیاں تھیں۔ راجا اندر کے اکھاڑے سے پریاں آئیاں تھیں۔[۵۱]"

ظاہر ہے کہ سرور کا یہ بیان شاہی ڈائننگ ہال (کھانا کھانے کا بڑا کمرہ) سے متعلق ہے جس کی تفصیلی کیفیت اُن کی زبان سے اوپر پیش کی جا چکی ہے۔ جب ڈائننگ ہال میں شراب و کباب، رقص و سرود کی صحبت سے اُٹھ کر بادشاہ آرام کرنے کے لیے محل میں جاتے تھے، اس وقت کی کیفیت سرور نے یوں بیان کی ہے۔

"آدھی رات جب گزری، یہ صحبت برخاست ہوئی۔ وہ جلسے والیاں اور محل کی گائنیں، پری وش۔۔۔۔۔۔ مرصع پوش آئیں، دھوم مچائیں۔ کوئی تلوے سہلانے لگی، کوئی۔۔۔ پنکھا ہلانے لگی، کسی نے کہانی شروع کی، کوئی ٹپا گنگنائی، کسی نے برجستہ شعر پڑھا، کسی کا چٹکی کے واسطے ہاتھ بڑھا۔[۵۲]"

---

۵۱ - فسانۂ عبرت صفحہ ۲۵ ۵۲ - فسانۂ عبرت صفحہ ۱۲

سرورؔ کے ان دونوں بیانوں سے جلسے والیوں کے مشغلوں پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ لیکن انھوں نے دونوں جگہ جلسے والیوں کے ساتھ گائنوں کو بھی شریک کر لیا ہے۔ اس لیے اب بھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ جلسے والیوں کے وہ خاص کام کیا تھے جو ان کو گائنوں کے زمرے سے الگ کرتے تھے۔ ایک موقع پر جلسے والیاں بادشاہ کی بھاری پوشاک کو سنبھالے ہوئے نظر آتی ہیں۔ اقتدار الدولہ کا بیان ہے کہ جب نصیر الدین حیدر سراج الدولہ کی بہن سے شادی کرنے کے لیے دولھا بن کر گئے" تو "اس قدر بھاری پُر زر جواہرات پہنے ہوئے تھے کہ کوئی سو عورت جلسے والیاں اس خلعت کو سنبھالے ہوئے تھیں۱؎" غرض کہ ایسا کوئی بیان نہیں ملتا جس سے جلسے والیوں کی پوری حقیقت کھلتی ہو یا ڈرامے کے جلسوں سے اُن کا کوئی تعلق ظاہر ہوتا ہو۔

راگنیوں کے جلسے نصیر الدین حیدر کے عہد میں ڈرامے کے باقاعدہ کھیل کا حال تو نہیں کھلتا، مگر ایسے جلسوں کا پتہ لگتا ہے، جن میں ڈرامائی شان ایک حد تک موجود تھی۔ سرورؔ لکھتے ہیں:۔

> کسی نے راگ مالے کی کتاب نذر دی۔ فرمایا اس کا جلسہ ہو۔ جو راگنی جس صورت و پوشاک سے دیکھی وہی صحبت ٹھہری۔ ایک بھیرویں کے جلسے میں پانسو عورت دُلھن کا لباس پہنے، ہاتھوں پاؤں میں مہندی لگی، چوڑی شہانی، سر سے پانگ جواہر کا زیور۔ ایک راگنی کی صحبت تیس دن ہوتی تھی، اندر کی سبھا کی آبرو کھوتی تھی۲؎

راگ مالا سرورؔ کی اس عبارت کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے کچھ باتیں ذہن میں موجود ہونا چاہئیں۔ راگ مالا ایسی کتاب کو کہتے ہیں، جس میں راگوں اور راگنیوں کی تصویریں

۱؎ تاریخ اقتداریہ قلمی ۲؎ فسانۂ عبرت ص ۱۳

بنی ہوتی ہیں۔ ایسی کتابیں موسیقی کے شوقینوں نے مرتب کر کے مختلف مصوروں سے تیار کروائی تھیں۔[1] راگ مالا کا وہ نسخہ جو نصیر الدین حیدر کے سے نفیس مزاج بادشاہ کو نذر دیا گیا تھا بے شبہ بہترین تصویروں پر مشتمل ہوگا۔ میں نے فن موسیقی کی ضخیم کتاب نادر نغمہ گر نتھ کے ایک مطبوعہ نسخے میں راگوں اور راگنیوں کی ادنی درجے کی تصویریں اور ان تصویروں کا بیان دیکھا ہے۔ اسی کتاب سے چند تصویروں کا بیان اپنے لفظوں میں پیش کرتا ہوں۔

راگ اور راگنیاں انسانی روپ میں

راگ (مرد)

مارو راگ:۔ سولہ برس کی عمر، ایک ہاتھ میں نیزہ، دوسرے میں تلوار جس سے دشمن پر وار کر رہا ہے۔

نائکی کانہرا:۔ کم عمر، زرد لباس، تال سُر سے گاتا ہوا۔ عورتوں نے گھیر کر پکڑ لیا ہو اور وہ دھوکہ دے کر نکل جانا چاہتا ہو۔

جیت راگ:۔ بڑا بہادر، تیر کمان ہاتھ میں، گھوڑے پر سوار، دشمن پر فتح پاکر گاتا اور روپیا لٹاتا ہوا۔

بھٹیا راگ:۔ سانولا رنگ، بازوؤں پر بازوبند باندھے ہوئے، ایک بہت بڑے پہلوان کو پچھاڑ کر خم ٹھونکتا ہوا اکھاڑے میں پھر رہا ہو۔

راگنیاں (عورتیں)

اہیری ٹوڈی راگنی:۔ نہایت حسین، نشیلی آنکھیں، گلابی پوشاک، سر پہ دودھ کے گھڑے

---

[1] مرزا حاتم علی بیگ مہر کے دیوان میں ایک قطعہ تاریخ کا عنوان ہو "تاریخ کتاب راگ مالا از راجۂ کاشی" یہ کتاب ۱۲۵۹ھ میں تیار ہوئی تھی۔

رکھے ہوئے، ٹھوکر سے دامن اٹھاتی ہوئی، دودھ دہی بیچنے

کے بہانے سے اپنے سوامی کو ڈھونڈھنے نکلی ہے۔

للتا گوری راگنی: شام کے وقت سنگار کر کے اپنے باغ میں ٹہل رہی ہے۔ توتے کا پنجرا

ہاتھ میں ہے، ایک سہیلی ساتھ میں ہے۔ اُس کے بچّے کو گود میں لیے

ہوئے اس سے ہنستی ہے اور اس کو پیار کرتی ہے۔

جھنجھوٹی راگنی:۔ نشے میں جھوم رہی ہے۔ اپنے شوہر کو دوسری عورتوں سے باتیں

کرتے دیکھ کر خفا ہو گئی ہے۔ سہیلیاں سمجھاتی ہیں، مگر وہ ضدّی

عورت ہے، سب کو اپنے پاس سے ہٹا دیتی ہے۔

کافی راگنی:۔ لال رنگ میں بھیگی ہوئی اپنے شوہر کے ساتھ ہولی کھیل رہی ہے۔

رنگ کے قمقمے تاک کر شوہر کو مارتی ہے، عبیر اور گلال اڑاتی، پھولوں

کے گیند مار کر چھپ جاتی ہے، اپنی سہیلیوں کو بلا کر اپنی اور اپنے

شوہر کی چھب دکھاتی ہے[ل۱]

راگوں اور راگنیوں کی تصویروں کا یہ بیان اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ

نصیر الدین حیدر کے حکم سے راگ مالا کا جلسہ جو تیار ہوا تھا اور راگنیوں کے جلسے جو

ہوتے تھے، ان میں ایک ڈرامائی کیفیت پائی جاتی تھی۔

نصیر الدین حیدر کے تفریحی مشغلے | نصیر الدین حیدر کی خانگی زندگی کے حالات اُن کے

ایک یورپین مصاحب سے سن کر ولیم نائٹن نے ایک کتاب انگریزی زبان میں لکھی ہے

اس کے دوسرے باب میں بادشاہ کے تفریحی مشغلوں کا بیان ہے۔ اس بیان کے فردی

اجزا لے کر ذیل میں ایک مسلسل عبارت کی صورت میں پیش کیے جاتے ہیں:۔

ل۱ نادر نوادر نغمہ۔

"ہم[1] لوگ ہال کی پشت کے چھوٹے کمرے میں بادشاہ سلامت کے منتظر بیٹھے تھے۔ نو بجے سے کچھ پہلے، جو محل میں خاصے کا معمولی وقت ہے، بادشاہ سلامت نمودار ہوئے۔ اعلیٰ حضرت سادہ سیاہ انگریزی لباس ... پہنے ہوئے تھے ...... اُن کے چہرے پر شرافت اور شاہانہ شان نمایاں تھی۔"

"کھانے کے کمرے میں ہم لوگ میز پر جا کر بیٹھے۔ بادشاہ ایک زرنگار کرسی پر رونق افروز ہوئے، جو زمین سے کچھ بلندی پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ میز کے ایک رُخ پر درمیان میں بیٹھے تھے اور ہم لوگ اُن کے دونوں پہلوؤں میں تھے۔ میز کا دوسرا رُخ بالکل خالی تھا، کچھ تو اس خیال سے کہ ملازموں کو پلیٹیں رکھنے اٹھانے میں آسانی ہو، مگر خاص کر اس غرض سے کہ اس رات کو جو کھیل تماشے ہونے والے تھے اُن کو دیکھنے میں بادشاہ سلامت کو دقت نہ ہو۔"

"ہم لوگ کھانے کے کمرے میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ نصف درجن نہایت حسین و جمیل خواصیں قیمتی پوشاکیں پہنے ہوئے پردہ کے پیچھے سے برآمد ہوئیں اور چپ چاپ بادشاہ کی کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر مورچھل ہلانے لگیں۔"

"کھانے کا سامان ہر حیثیت سے یورپین طرز کا تھا۔ ہندوستانی خدمت گار ادب قاعدہ سے خاموشی کے ساتھ آتے جاتے تھے۔ کھانا بہت عمدہ پکا ہوا تھا، کیونکہ ایک فرانسیسی رکاب دار شاہی مطبخ کا مہتمم تھا۔

---

[1] نصیر الدین حیدر کے یورپین مصاحب

کھانے کے بعد بہترین قسم کے خوش مزہ پھل اور میوے میز پر لگا دیے گئے، اور اسی کے ساتھ کھیل تماشے شروع ہو گئے۔ یہ تماشے، جیسا کہ مجھ کو بعد کو معلوم ہوا، بہت اور مختلف قسموں کے تھے۔ کبھی بازی گر اپنے کرتب دکھاتے تھے۔ وہ اپنے جسموں میں گرہیں لگا لیتے تھے، گویا ان کے بدن میں ہڈی تھی ہی نہیں۔ بندروں کی سی حرکتیں کرنے میں وہ بندروں سے بھی بڑھ جاتے تھے۔ کبھی دربار کے مسخرے آپس میں لطیفہ بازی کرتے تھے، کبھی مداری اور سپیرے اپنے کرتب دکھاتے تھے۔ کبھی مرغوں، بٹیروں اور تیتروں کی لڑائی ہوتی تھی۔ کبھی کٹھ پتلیوں کا تماشا ہوتا تھا جس میں پتلیاں اس طرح کام کرتی اور ناچتی تھیں جس طرح آجکل کے ڈراموں میں انسان۔ ان تماشوں کے ساتھ بالعموم ہال میں کسی جگہ رنڈیوں اور سازندوں کا طائفہ گاتا بجاتا رہتا تھا۔

"جب میں شاہی میز پر کھانا کھانے کے لیے پہلی مرتبہ حاضر ہوا تھا، تو اس ڈنر کے تفریحی سامان میں کٹھ پتلیوں کا تماشا اور حسب معمول ناچ گانا تھا۔ بادشاہ پتلیوں کے تماشے دیکھ کر خوب ہنسے اور بہت محظوظ ہوئے۔ ناچ گانا ہوتا رہا، مگر میرے سوا کسی نے اُدھر توجہ نہ کی۔ بادشاہ کٹھ پتلیوں کے تماشے ہی میں مصروف رہے اور ہر شخص اسی کو دیکھتا اور تعریف کرتا رہا۔"[1]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیر الدین حیدر کو ناچ گانے سے زیادہ کھیل تماشوں سے دل چسپی تھی اور ان کے یہاں کم سے کم ایک تماشا ایسا ضرور ہوتا تھا جس میں

---

[1] ایک مشرقی بادشاہ کی خانگی زندگی (زبان انگریزی) صفحہ ۲۵

ڈرامائی کیفیتیں اس حد تک موجود تھیں، کہ ایک انگریز تماشائی کو اس میں اور اس عہد کے ڈراموں میں مشابہت نظر آئی اس کا یہ قول اس محل پر خاص اہمیت رکھتا ہو کہ کٹھ پتلیوں کے تماشے میں "پتلیاں اس طرح کام کرتی اور ناچتی تھیں جس طرح آجکل کے ڈراموں میں انسان"۔

غرض کہ نصیر الدین حیدر کے عہد میں کم سے کم دو ایسی چیزیں ضرور ملتی ہیں جن میں ڈرامائی شان موجود تھی، ایک راگنیوں کے جلسے، دوسرے کٹھ پتلیوں کا تماشا۔ اور صاف نظر آتا ہو کہ لکھنو کے شاہی اسٹیج کی بنیاد پڑ رہی ہو۔

نصیر الدین حیدر کے بعد :۔ ۴ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ (۷ جولائی ۱۸۳۷ء) کو نصیر الدین حیدر کو زہر دیا گیا۔ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی وہ عیش و عشرت کا کارخانہ اجڑ گیا اس جواں سال بادشاہ کی جگہ پر اسی کے ساٹھ برس کے بوڑھے اور مفلوج چچا محمد علی شاہ اودھ کے تخت پر بٹھائے گئے۔ ان کی طبیعت ناچ گانے اور کھیل تماشے کی طرف مائل نہ تھی۔ وہ سلطنت کے انتظام اور امور خیر کے انصرام میں مصروف ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا۔ کہ نصیر الدین حیدر کا قائم کیا ہوا جلسہ درہم و برہم ہو گیا۔ اس سلسلے میں سرور لکھتے ہیں:۔

"اب دو کلمے جلسے کی خرابی کے، اور جو جو پری پیکر میرزا نصیر الدین حیدر بادشاہ مبرور کے نذر نظر تھے، ان کی پردہ دری اور بے حجابی کے سنئے۔ جلوس کے بعد بادشاہ خجستہ خصال معدلت پناہ (محمد علی شاہ) نے امور ملکی و مالی سے جب فرصت پائی، فرد خانگی روبرو آئی۔ فرد فرد کی لیاقت کے موافق درماہے مقرر کیے۔ اور جو جو منکوحہ خوش سلیقہ صاحب وثیقہ تھیں ان کے (وثیقے) بدستور رہے۔ لیکن رنڈی کی ذات ذلیل الاوقات، قدر نعمت کسی نے نہ جانی، شیطان کے وسوسے سے شہر کی خاک چھانی .... عرضداشت لکھی کہ ہم اپنے اپنے گھر

جائیں گے ، ماں باپ کو دیکھیں دکھائیں گے ۔ مطلب اُن کا سمجھ کے تنبیہہً ارشاد ہوا کہ جو باہر جائے گی ، ایک جوڑے کے سوا اور کچھ نہ پائے گی ۔ ان بدمستوں نے جو کچھ جوڑا تھا وہیں چھوڑا ، عزم بے جا سے منھ نہ موڑا[۱]"

آگے چل کر مرحوم اور موجود بادشاہوں کے زمانے کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"ان دنوں لکھنؤ میں رنڈیوں کی یہ کثرت ہوئی کہ گلی کوچے بھر گئے۔ ...... اب رنڈیوں کی حالت تباہ ہو .... اگر محمد علی شاہ سا بادشاہ معدلت پناہ اور نواب شرف الدولہ محمد ابراہیم سا وزیر خیر خواہ نہ ہوتا تو لکھنؤ کی بدنامی کون کھوتا[۲]"

محمد علی شاہ پانچ برس سلطنت کر کے انتقال کر گئے اور ان کے بیٹے امجد علی شاہ پانچ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ (۱۶ دسمبر ۱۸۴۲ء) کو تخت نشین ہوئے۔ وہ اپنے باپ سے بھی زیادہ محتاط اور پابند شریعت تھے۔ ایک مورخ کا بیان ہے کہ "امجد علی شاہ بڑا دین دار اور عادل بادشاہ تھا۔ عدالت کا کام سلطان العلما[۳] اور سید العلما[۴] کو سونپا اور اپنی اوقات خدا کی عبادت میں بسر کرتا تھا[۵]" سرور نے بھی امجد علی شاہ کو "نماز گزار شب زندہ دار" لکھا ہے[۶]۔ اس بادشاہ کے عہد میں علمائے مذہب کو بڑا عروج ہوا اور سلطنت کا کاروبار زیادہ تر علما کے ہاتھ میں آگیا۔ یہاں تک کہ آبکاری کا محکمہ بھی ایک عالم دین کے سپرد ہوا۔ اس وقت کے ایک ظریف شاعر کا یہ طنزیہ شعر اب تک بعض لوگوں کی زبان پر ہے

۱؎ فسانۂ عبرت صہ ۱۴ ۲؎ فسانۂ عبرت صہ ۴۱-۴۲ ۳؎ سلطان العلما مولوی سید محمد صاحب مجتہد ۴؎ سید العلما مولوی سید حسین صاحب ۔ یہ سلطان العلما کے چھوٹے بھائی تھے۔
۵؎ مختصر سیر گلشن ہند مولفہ بالو رام ۱۸۷۶ء صہ ۱۱۸ ۶؎ فسانۂ عبرت صہ ۷۶

شراب جو نہ پئے آج کل وہ ناری ہے
جناب قبلہ و کعبہ کو آب کاری ہے[1]

مرقع خسروی میں ہے کہ امجد علی شاہ کے عہد میں غالباً ۱۲۶۰ھ میں آبکاری کا محکمہ مجتہد العصر کے ایک عزیز قریب کے سپرد کیا گیا۔ اس پر کسی شاعر نے یہ بیت کہی

پئے نہ بادہ جو اس دور میں وہ ناری ہے
محب ساقیِ کوثر کو آب کاری ہے[2]

سرور کہتے ہیں:۔

۔۔ اجتہاد کی وقت وخواری ہے، مجتہد کے سپرد خدمت آبکاری ہے۔[3]

اسلامی شریعت رقص و سرود کو حرام اور لہو و لعب کو ناجائز قرار دیتی ہے۔ اس لیے اس عہد میں بھی یہ چیزیں شاہی سرپرستی سے محروم رہیں۔

---

[1] کہا جاتا ہے کہ یہ شعر میاں مشیر، شاگرد مرزا دبیر کا ہے۔ ادیب

[2] مرقع خسروی ورق ۱۶۲ د [3] فسانۂ عبرت ص۹۲



اردو ڈرامے اور اسٹیج کے بانی

سلطان عالم واجد علی شاہ اختر بادشاہ اودھ

شاہی اسٹیج کا معمارِ اعظم

ولادت ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۳۸ھ (۳۰ جولائی ۱۸۲۲ء) کو اودھ کے شاہی خاندان میں وہ بچہ پیدا ہوا جو بڑھ کر ہندوستانی موسیقی، رقص اور ڈرامے کا اپنے عہد میں سب سے بڑا سرپرست نکلا، یعنی مرشد زادہ[1] مرزا واجد علی شاہ جو تقریباً چھبیس سال بعد ابوالمنصور ناصر الدین سکندر جاہ سلطانِ عالم واجد علی شاہ کے لقب سے اودھ کے تخت پر بیٹھا اور اسی پر اودھ کی شاہی کا خاتمہ ہوا۔ اس وقت اودھ میں غازی الدین حیدر کی حکومت تھی اور اس بچے کے دادا نصیر الدولہ مرزا محمد علی خاں کے بڑے بھائی تھے۔

بچپن جب یہ بچہ سنِ تمیز کو پہنچا تو نواب امین الدولہ امداد حسین خاں اس کے اتالیق مقرر ہوئے۔ وہ ایک سنجیدہ، ثقہ اور دین دار آدمی تھے اور اسلامی شرع کے مطابق ناچ گانے کو حرام سمجھتے تھے۔ مگر مرشد زادے کو بچپن ہی سے ناچنے گانے کا بے حد شوق تھا۔ وہ سبق پڑھتے وقت اکثر تال کے ساتھ اپنے پیروں کو حرکت دیا کرتا تھا۔ استاد نے کئی دفعہ منع کیا۔ جب مرشد زادہ اس حرکت سے باز نہ آیا تو ایک دن غصے میں ایک طمانچہ کنپٹی پر اس زور سے مارا کہ ادھر کے کان سے کچھ کم سنائی دینے لگا۔[2] ایک معتبر راوی سے

---

[1] عہد شاہی کی اصطلاح میں بادشاہ کے بیٹوں کو شاہزادہ اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد کو مرشد زادہ کہتے تھے۔ [2] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا کا جو قلمی نسخہ کتب خانۂ مشرقیہ، پٹنہ میں ہے اس کے حاشیے پر غالباً خود مصنف نے مرزا محمد تقی اختر کی زبانی ایک حکایت بیان کی ہے۔ اس میں یہ فقرے ملتے ہیں "سلطانِ عالم کے گوشِ مبارک میں ... از حد ثقلِ سماعت ہے" اور "... بدولت اختر ... مدام کا بہرہ ہے"۔ واجد علی شاہ کو خفیف سا ثقلِ سماعت تھا۔ مگر مرزا محمد تقی جو خود بہت بہرے تھے اس کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ (ادیب)

سنا ہو کہ واجد علی شاہ استاد کی اس عنایت کا کبھی کبھی ذکر کیا کرتے تھے۔

دادا کی بادشاہی غازی الدین حیدر کے بعد ان کے فرزند نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے اور کوئی دس برس سلطنت کر کے ۲۳ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ (۷ جولائی ۱۸۳۷ء) کو دنیا سے کوچ کر گئے۔ اُن کے بعد اُن کے بیٹے مرزا فریدوں بخت عرف منّا جان تخت پر بیٹھے، مگر انگریزوں نے اُن کو نصیر الدین حیدر کا بیٹا تسلیم نہیں کیا اور تخت نشینی ہی کے دن ان کو معزول کر کے مرحوم بادشاہ کے بوڑھے چچا مرزا واجد علی خاں کے دادا نصیر الدولہ محمد علی شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ محمد علی شاہ نے اپنے بیٹے ثریا جاہ مرزا امجد علی خاں کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ اب تک مرزا واجد علی خاں کی زندگی ایک امیر زادے کی طرح آرام سے گزر رہی تھی، مگر اُن کے ہاتھ میں زیادہ روپیا نہیں رہتا تھا۔ جب ان کے دادا محمد علی شاہ اودھ کے بادشاہ اور باپ امجد علی خاں ولی عہد ہو گئے تو انکی مالی حالت کسی قدر بہتر ہو گئی۔

واجد علی شاہ نے لکھا ہو کہ جب میرے دادا نے تخت نشین ہو کر میرے اور میری زوجہ کے سوا ہر ادنیٰ اور اعلیٰ کو معقول مشاہرے سے سرفراز کیا تو میرے والد نے میرا ملال دور کرنے کے لیے پانچ سو روپیہ ماہوار میرا اور چار سو میرے محل کا مقرر فرمایا[1]۔ یہ آمدنی بھی ایسی نہ تھی کہ ناچ گانے کا مہنگا شوق پورا کیا جا سکتا۔

باپ کی بادشاہی پانچ برس اسی حالت میں گزر گئے۔ یہاں تک کہ ۵ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ (۱۶ جولائی ۱۸۴۲ء) کو اُن کے والد امجد علی شاہ اودھ کے بادشاہ ہوئے اور وہ خود ولی عہد مقرر ہوئے۔ اب اُن کی آمدنی اور اختیارات میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ ان کے والد امجد علی شاہ جب ولی عہد مقرر ہوئے تھے تو ان کی تنخواہ پچیس ہزار[2] روپے اور

---

۱ محل خانۂ شاہی ص ۱۳ ۲ سوانح عمری مولفہ حکیم محمد کاظم ص ۲۷



واجد علی شاہ پری خانے میں

ان کے پیش دست شرف الدولہ ابراہیم خاں کی تنخواہ دس ہزار روپے ماہوار مقرر ہوئی تھی[1]۔ اودھ کا برطانوی سفیر سلیمن لکھتا ہے کہ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے وزیر روشن الدولہ کی تنخواہ پچیس ہزار روپے ماہوار تھی اور ریافت کے دوسرے ذریعے اور اہل و عیال کا وثیقہ ملا کر پندرہ لاکھ سالانہ کی آمدنی تھی[2]۔ امجد علی شاہ کے وزیر کی تنخواہ اور آمدنی بھی ایسی ہی کچھ ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ ولی عہد سلطنت کی حیثیت وزیر سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتی۔

پریاں

ولی عہدی کے وقت واجد علی شاہ بیس برس کے نوجوان تھے، ناچ گانے کا شوق شباب پر تھا اور روپے کی کمی نہ تھی۔ حسین اور خوش گلو طوائفیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کی گئیں۔ جو عورتیں ناچنے گانے کے فن میں کامل نہ تھیں، ان کی تعلیم کے لیے استاد مقرر کیے گیے اور اچھے اچھے سازندے نوکر رکھے گیے۔ یہ طوائفیں "پریاں"[3]، اور ان کے استاد "بہار محفل"[4] والے، کہلاتے تھے۔ واجد علی شاہ لکھتے ہیں:۔

"مجھ کو جلسے[5] کے ترتیب دینے اور گانے والیوں کے جمع کرنے کا بہت خیال تھا۔ اس سبب سے سازندوں اور علم موسیقی کے کاملوں کی تلاش بہت تھی، کہ پریوں کو تعلیم دی جائے اور ان کی مشق ترقی پذیر ہو[6]"

پری خانہ

ابتدا میں پریوں کی تعلیم "خاص مکان" میں ہوتی تھی۔ جلسیں چھوڑ دی جاتی

---

[1] قیصر التواریخ جلد اول صفحہ ۳۶۶ [2] سلیمن کا سفرنامۂ اودھ جلد دوم بزبان انگریزی ۱۸۵۸ء صفحہ ۱۸۳ [3] واجد علی شاہ جس طوائف کو نوکر رکھتے تھے اس کا نام بدل کر کوئی پری خطاب دے دیتے تھے۔ مثلاً سلطان پری، سلیمان پری، عزت پری، ماہ رخ پری۔

[4] محل خانۂ شاہی صفحہ ۴۷ [5] جلسے، سے یہاں غالباً اس کا جلسہ مراد ہے جو واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں تیار کیا تھا۔ [6] محل خانۂ شاہی صفحہ ۴۷

تھیں۔ باہر پریوں کو ناچ گانے کی تعلیم دی جاتی تھی اور چلمن کے پیچھے شاہزادہ مرزا واجد علی خاں کبھی ستار بجاتے اور کبھی گانے کی مشق کرتے تھے۔ کچھ دن بعد ایک مکان پریوں کی تعلیم کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ اس کے صحن میں سفید سنگ مرمر کا فرش کر کے نفیس نفیس چینی گلدستے قاعدہ سے لگائے گئے، جگہ جگہ تختوں کے چوکے اور پلنگ وغیرہ بچھائے گئے اور فرش فروش، پردوں اور آرائش و زیبائش کے دوسرے سامانوں سے خوب سج سجا کر اس کا پری خانہ نام رکھا۔ اس کے دروازے پر ترک سوارنیوں کا پہرہ رہتا تھا۔ پریوں اور ان کے استادوں کے سوا کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ صرف دو تین عورتیں اس عام ممانعت سے مستثنیٰ تھیں۔ پری خانہ میں دو دو تین تین پہر پریوں کی تعلیم ہوا کرتی تھی اور ولی عہد بہادر خود بھی علم موسیقی کی تحصیل میں مصروف رہتے تھے۔[1]

ولی عہد نے پری خانے کا انتظام نواب خاص محل کے سپرد کیا۔ انھوں نے پریوں کے لیے رنگ رنگ کے لباس تیار کروائے اور پری خانے کی درستی میں بڑی مستعدی اور جاں فشانی سے کام کیا۔[2] یہ خاص محل کا انتہائی ایثار تھا کہ صرف شوہر کی خوشی کیلئے ان طوائفوں کی آرائش و آسائش کے سامان کرتی رہیں، جن میں اکثر ان کے شوہر کی منظورِ نظر تھیں، جن کی ناز برداری اور خاطر داری میں بے دریغ روپیہ صرف کیا جا رہا تھا۔ لیکن ان حالات کو وہ زیادہ دن برداشت نہ کر سکیں اور پری خانہ کے انتظام میں پہلا سا انہماک باقی نہ رہا۔ بلکہ اب وہ پریوں سے جلنے لگیں اور ان کی پوشاکوں اور زیوروں کی درستی میں کوتاہی کرنے لگیں۔ یہ حالت دیکھ کر ولی عہد نے پری خانہ خاص محل کے

---

[1] محل خانۂ شاہی صہ ۴۸-۴۹ [2] محل خانۂ شاہی صہ ۵۳

ہاتھ سے نکال کر محمد حسین علی خواجہ سرا کے سپرد کر دیا اور اس کو معتمد علی خاں خطاب عنایت کیا[1]۔ اُس نے اس خدمت کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا اور ولی عہد کی سرکار سے الطاف و عنایات کا مستحق ٹھہرا۔

یہ پری خانہ موسیقی کی ایک درس گاہ یا میوزک کالج تھا جہاں استادوں کی تنخواہ اور شاگردوں کی آسائش و آرائش، لباس و زیور پر کئی لاکھ روپیہ سالانہ صرف ہوتا تھا[2]۔

پریوں کا مکتب

ایک مرتبہ ولی عہد بہادر نے نو پریوں کو شان دار خطابات دے کر بیگموں کے درجے پر پہونچا دیا۔ ان بیگموں اور پریوں کے لیے موسیقی کی تعلیم کا انتظام تو پہلے ہی سے تھا، اب ان کے پڑھنے لکھنے کا انتظام بھی کر دیا گیا۔ ایک علیحدہ مکان ان کا مکتب قرار پایا اور ایک مولوی مرزا احسن نام ان کو پڑھانے کے لیے مقرر کیے گئے۔ ہر ایک نے اپنی لیاقت کے موافق علوم شرعیہ کی تحصیل کی۔ تعلیم و تدریس کا یہ سلسلہ ولی عہد بہادر کی تخت نشینی تک جاری رہا[3]۔

پریوں کے پَر

شاہی محل میں مختلف تقریبوں کے موقعہ پر جو جشن ہوتے رہتے تھے ان میں پریاں، ناچتی گاتی تھیں۔ جب ولی عہد کی خاص محل کے یہاں مرزا ابیدار بخت پیدا ہوئے تو ان کے دادا امجد علی شاہ کے حکم سے ایک جشن جمشیدی، منعقد کیا گیا۔ پریوں نے نفیس پیشوازیں اور بیش بہا جواہرات پہنے۔ ان میں حسن و جمال تو قدرت کا دیا ہوا موجود ہی تھا، جو کمی رہ گئی تھی وہ انسانی صنعت نے پوری کر دی۔ یعنی ان کے کارچوبی پَر بھی لگا دیے گیے[4]۔

---

[1] محل خانۂ شاہی ص ۶۲ [2] محل خانۂ شاہی ص ۵۴ [3] محل خانۂ شاہی ص ۱۲۳
[4] محل خانۂ شاہی ص ۵۷

شاہی اسٹیج کی ارتقائی منزلیں

پہلی منزل: واجد علی شاہ کا جوگی بننا

اس رسم کی بنیاد واجد علی شاہ کی پیدائش کے وقت جوتشیوں نے زائچہ دیکھ کر بتایا تھا کہ اس بچے کی قسمت میں جوگی ہونا ہے اور طالع کی یہ نحوست اس طرح دور ہو سکتی ہے کہ یہ بچہ ہر سال گرہ کے موقعہ پر جوگی بنا دیا جایا کرے۔ جوتشیوں کی اس ہدایت کے مطابق بچے کی والدہ ہر سال اس کی پیدائش کے زمانے یعنی ساون کے مہینے میں اس کو جوگی بنایا کرتی تھیں۔ منشی رام سہائے تمنا واجد علی شاہ کے قائم کیے ہوئے قیصر باغ کے جوگیانہ میلے کی بنا کا یوں ذکر کرتے ہیں:-

"اختر شناسوں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ زائچہ ہمایوں میں جوگ کا بجوگ ہے دفع نحوست کی تدبیر واجب ہے۔ اگر عہد سلطنت میں حالت فقیری اختیار کی جائے تو نحوست بہ سعادت مبدّل ہو جائے۔ خدیو گیہان نے بنظر دور اندیشی حسب احکام انجم شناساں بزم جوگ آراستہ کی۔ جوگیانہ لباس زیب تن فرمایا۔"[1]

اس بیان سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ واجد علی شاہ کے جوگی بننے کی رسم کی بنیاد کیونکر پڑی مگر یہ غلط فہمی بھی پیدا ہوتی ہے کہ خود واجد علی شاہ نے اپنی بادشاہی کے زمانے میں اس رسم کی ابتدا کی۔ لیکن ایک ہم عصر مؤرخ کے بیان سے یہ غلط فہمی دور ہو کر اصل

---

[1] افضل التواریخ ص ۱۰۸

حقیقت واضح ہو جاتی ہو. مرزا محمد تقی اپنی کتاب آفتاب اودھ میں قیصر باغ کے جوگیانہ میلے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"مشہور ہو کہ یہ میلہ اس وجہ سے مقرر ہوا تھا کہ حضرت بادشاہ کی والدۂ ماجدہ یعنی جناب ملکہ کشور صاحبہ نے ان کی سال گرہ میں اولاً بہ ایام طفولیت حضرت کو پوشاک جوگیانہ پہنائی تھی۔ اسی بنا پر ایام سلطنت میں ہر سال یہ میلہ عام بہ لباس جوگیانہ قرار پایا تھا"[۱]

مشہور زمانہ مطبع کے بانی منشی نول کشور لکھتے ہیں۔

"واجد علی شاہ کی چھٹی کی آرزو پر اُن کی ماں نے لڑکپن میں جوگیانہ لباس پہنایا تھا۔ اس کی سال گرہ اسی لباس سے ہوتی تھی، بادشاہ نے عہد سلطنت میں میلہ قرار دیا"[۲]

جوگی بننے کی یہ رسم محل کے اندر ہر سال ادا کی جاتی تھی۔ اور غالباً اس موقعہ پر کوئی جشن یا جلسہ نہیں کیا جاتا تھا۔

حضور باغ ولی عہد بہادر نے کئی باغ بہت پُر فضا کئی کئی لاکھ روپے کے صرف سے تیار کیے تھے ان میں سے ایک کا نام حضور باغ تھا[۳]۔ اس میں دو نہریں بہت خوش نما تھیں۔ ایک کا نام چشمۂ شیریں، دوسری کا چشمۂ فیض تھا۔ نہروں کے چاروں طرف فوارے تھے جگہ جگہ سنگ مرمر کے مجسّمے، چینی مرتبان اور پتھر کے گلدستے رکھے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے گنجان درختوں کے نیچے سنگ مرمر کی چوکیاں بچھی ہوئی تھیں۔ شہتوت کا ایک بہت ہی بڑا اور چھتنار درخت تھا۔ اتنا بڑا درخت کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔

---

[۱] آفتاب اودھ قلمی [۲] تواریخ نادر العصر ص ۱۲۶

[۳] حضور باغ کا تفصیلی حال خود واجد علی شاہ نے لکھا ہو۔ دیکھیے "عشق نامہ" فارسی ص ۱۲۳-۱۲۹

اس کے نیچے سنگ مرمر کا چبوترا بنا ہوا تھا ہر جمعہ کو اس درخت کے نیچے پریوں اور گوپیوں کا مجمع ہوتا تھا[1]۔ اس باغ میں ہر فصل کے لیے ایک نہایت آرام دہ مکان بنایا گیا تھا۔ جاڑوں کے لیے شہنشاہ منزل، گرمیوں کے لیے خاص مکان اور برسات کے لیے ایک بنگلہ فلک سیر نام باغ کے بیچوں بیچ میں تھا۔ اسی حضور باغ میں ولی عہد نے اپنے جوگی بننے کی سالانہ رسم کو ایک جشن اور ناچ گانے کے جلسے کی صورت دیدی۔ پہلی مرتبہ یہ جشن جس طرح منایا گیا تھا کہ اس کا تفصیلی بیان خود واجد علی شاہ نے فارسی میں لکھا ہو۔ اس بیان کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جوگی بننے کا جشن ایک مرتبہ جب کہ چاروں طرف گھٹائیں گھری ہوئی تھیں، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، حضور باغ حسین عورتوں کے ہجوم سے پرستان بنا ہوا تھا، اس عالم میں ولی عہد بہادر اس شان سے جوگی بنے کہ جوگیانہ سامان بدن پر، اززگار ساڑے دو گز چینی دوپٹا کمر میں لپٹا ہوا، سچے موتیوں کی راکھ چہرے پر لگی ہوئی، جوگیانہ سیلی اور موتیوں کا کنٹھا گلے میں، بیراگن ہاتھ میں اور "یا ہو" کا نعرہ زبان پر۔ معشوقہ خاص[2]

---

[1] سنسکرت کی قدیم کتاب ہری ونس میں ہے کہ جنگل میں گھومتے پھرتے ایک دن سری کرشن اور ان کے ساتھ کے لڑکوں نے برگد کا ایک بہت بڑا درخت دیکھا جو ایک وسیع رقبے پر چھایا ہوا تھا۔ اس دن سے کرشن اس عظیم الشان درخت کے نیچے روز لڑکوں کے ساتھ طرح طرح کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ (حیات و تعلیمات سری کرشن صنہ ۵۰۔۵۱)

کچھ عجب نہیں کہ واجد علی شاہ نے اسی بات کو نظر میں رکھ کر پریوں کے ہفتہ وار اجتماع کے لیے شہتوت کا یہ عظیم الشان درخت منتخب ہوا۔ ادیب

[2] ایک طوائف اچھے صاحب نام جو بیاوالی کہلاتی تھی۔ (محل خانۂ شاہی صہ ۵۹)

اور سکندر بیگم[1] جو گیَن بنیں۔ ان کی آرائش یہ تھی کہ سبز رنگ کی بنارسی چادروں کی گاتیاں بدن پر لپٹی ہوئی، سچے موتیوں کی معتبر دانگھ چہروں پر پڑی ہوئی، سر کے بال کھلے ہوئے، گوشوارے اور موتیوں کی لڑیاں چاند سے رخساروں پر پڑی ہوئی۔ سازندوں نے طرح طرح کے ساز چھیڑے اور مطربوں نے نغمے کی آواز آسمان تک پہونچائی۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو نم نہ ہو، کوئی دل نہ تھا جو بے تاب نہ ہو۔ اتنے میں جوگی جی جوگنوں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے اس ساز و آواز کے ہنگامے میں سے گزرے۔ راگ رنگ ہوا سے برس رہا تھا۔ دیکھنے والوں کو ایک پرستانی طلسم نظر آرہا تھا۔ بے خودی کا عالم طاری تھا۔ یہ حالت تھی کہ۔

شجر مست، گل مست، ہر خار مست
زمیں مست، در مست، دیوار مست[2]

یہ مجمع اسی بے خودی کے عالم میں پہروں رہے رواں ہوا اور شام کے قریب باغ کے ایک کنج کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ سحر طراز مغنیوں نے ہمیر کی راگنی اور جنگلے میں ناگہ کا یہ خیال گانا اور بجانا شروع کیا۔

کر سانولا سے یاری میں جوگن بھئی رے[3]

---

[1] ایک طوائف امراؤ نام جو عمدہ خانم والی کہلاتی تھی (محل خانہ شاہی ص ۶۶) لکھنؤ کا سکندر باغ اسی سکندر بیگم کے نام سے موسوم ہو۔ [2] عشق نامہ منظوم ص ۳۲۷

[3] اس مقام کو عشق نامہ منظوم میں یوں لکھا ہے:۔

مسرت جو تھی مطربوں کو کمال | یہ اُس وقت ناگر کا گایا خیال
ہوئی ریت پھر سانولا سے نئی | میں جوگن بھئی رے میں جوگن بھئی
کبھی راگ جنگلے کا گانے لگے | بیابان وحشت دکھانے لگے

(عشق نامہ منظوم ص ۳۲۸)

پھر جوگی جی بیراگن کو بغل کے نیچے اور داہنا پیر بائیں ران پر رکھ کر شیر کی طرح بیٹھ گئے۔ اُن کی رانوں کی تیاری، سینے کا اُبھار، شانوں کی گولائی اور رخساروں کی چمک بیان سے باہر تھی۔ جوگنیں اس طرح ناچ گانے میں مقابلہ کر رہی تھیں کہ دیکھنے والوں پر بے خودی کا عالم طاری تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

جب شام ہو گئی اور چاند نکل آیا تو جوگی جی نے اٹھ کر رفعت منزل کے قریب نہر پر قیام کیا۔ مہتابیاں روشن ہوئیں، آتش بازی چھوٹنے لگی۔ ایک گھڑی رات گزری تھی کہ جوگی جی پر کنھیا کی حالت نمایاں ہوئی اور وہ طرح طرح کے جلوے دکھانے لگے۔ پہلی جھانکی کی صورت یہ تھی کہ چمپئی رنگ کا بہت مہین، زرنگار، مسالے دار دوپٹا کمر سے لپٹا ہوا اور اس کا ایک آنچل بائیں شانے پر سے بغل کے نیچے لٹکتا ہوا اور دوسرا آنچل منہ پر جس سے پھول سے رخسار نمایاں، داہنا ہاتھ سر پر اور بایاں ہاتھ خم کیا ہوا کمر پر۔ دوسری جھانکی اس کے برعکس تھی دوپٹے کا ایک آنچل داہنی جانب بغل کے نیچے لٹکتا ہوا، دوسرا منہ پر، بایاں ہاتھ سر پر، داہنا ہاتھ کمر پر۔ یہ جلوے دیکھ دیکھ کر سب بے خود ہو رہے تھے۔ پری پیکر حسینائیں ناچنے گانے میں مصروف تھیں۔ جب آدھی رات گزر گئی تو یہ محفل برخاست ہوئی۔ کئی سال ساون کے مہینے میں یہ راگ رنگ کی محفل منعقد ہوتی رہی اور ہر سال نیا لطف اٹھتا رہا[1]

شاہی کے زمانے میں واجد علی شاہ جوگی بننے کی سالانہ رسم اور زیادہ دھوم سے منانے لگے۔ انھوں نے اپنی کتاب عشق نامہ ۱۲۶۵ھ[2] میں لکھی۔ اس میں لکھا ہو کہ سال

---

[1] عشق نامہ فارسی، ص ۱۲۶-۱۴۴ [2] میرے کتب خانہ میں عشق نامہ منثور فارسی اور عشق نامہ منظوم اردو کے جو قلمی اور مطبوعہ نسخے موجود ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کچھ کچھ مدت کے بعد اس مدت میں پیش آنے والے واقعات کا اضافہ کرتے رہتے تھے۔

گزشتہ وپیوستہ جوگی بننے کی ہم میں معشوقۂ خاص کے عوض قیصر بیگم[1] اور سکندر محل کے عوض گلزار بیگم[2] جوگن بنی تھیں[3]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۶۳ھ اور ۱۲۶۴ھ میں یعنی بادشاہ ہونے کے پہلے اور دوسرے سال میں بھی واجد علی شاہ نے جوگی بننے کا جشن دھوم سے منایا تھا۔ انھوں نے اس جشن کا ذکر عشق نامۂ منظوم میں یوں کیا ہے۔

"ہوئی بلکہ ترتیب بزم رہس — جو اگلے برس اور پچھلے برس
یہ قیصر طرح دار و پُرفن بنی — یہی جائے معشوقہ جوگن بنی
سکندر محل کی تھی قائم مقام — وہ بیگم کہ گلزار ہے جس کا نام"[4]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جوگی بننے کے جشن میں رہس کا جلسہ بھی ہوا کرتا تھا۔

بیخود لکھنوی کا بیان | اس شاہی تقریب کا حال بیخود لکھنوی نے اپنی مثنوی جلوۂ اختر میں کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ ہم اس کا خلاصہ اپنے لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

شاہی محفل میں شریک ہونے والے سب لوگ بادشاہ کے حکم سے حضرت باغ میں جمع ہوئے۔ رہس کے طائفے آنے لگے۔ اُن میں سلطانی رہس کی شان سب سے زیادہ تھی۔ اس کے ساتھ زرق برق وردیاں پہنے ہوئے خوش رو مسلح جوانوں کا ایک دستہ بھی تھا۔ رہس کی پریاں چہروں پر بھبھوت لگائے، جوگنیں بنی ہوئی باغ میں داخل ہوئیں۔ وہاں بادشاہ کو نہ پاکر پریشان ہوگئیں اور ان کو ڈھونڈتی پھریں۔ ایک ایک سے پوچھتی تھیں کہ ہمارا جانِ عالم، ہمارا کنھیا کہاں ہے[5]

---

[1] ایک طوائف حسن باندی نام جو حسینی والی کہلاتی تھی (محل خانۂ شاہی صفحہ ۱۳۰) [2] امیر بخش طوائف کی بیٹی کرم بخش۔ (محل خانۂ شاہی صفحہ ۱۲۹) [3] محل خانۂ شاہی صفحہ ۱۳۰)

[4] عشق نامۂ منظوم صفحہ ۱۴۳ [5] جوگی جی کا غائب ہوجانا، جوگنوں کا اُن کو ڈھونڈھتے پھرنا اور ایک ایک سے ان کا پتہ پوچھنا راس لیلا کا وہ موقع یاد دلاتا ہے جب کرشن جی یکایک غائب ہوگئے تھے اور گوپیاں اُن کو ڈھونڈتی اور اُن کا پتہ پوچھتی پھرتی تھیں۔ ادب

جب کہیں پتہ نہ لگا تو اُن کی بے قراری بڑھنے لگی اور اس اضطراب کے عالم میں وہ بادشاہ کی یہ غزل گانے لگیں ۔

الٰہی! سبب کون سا ہو گیا　　کہ یوں ماہ پیکر خفا ہو گیا
یہاں تک کیا یار کا انتظار　　کہ تنگ اب مرا حوصلہ ہو گیا
یہ ادنیٰ ہو نیرنگیِ چرخِ دوں　　وفادار بھی بے وفا ہو گیا
ڈبویا مجھے بحرِ اندوہ میں　　مرا دل ہی قاتل مرا ہو گیا
کسی طرح اب دل بہلتا نہیں　　یہ حیران ہوں مجھ کو کیا ہو گیا

چھپایا جو اخترؔ سے منھ آپ نے
قصور اُس سے کیا آپ کا ہو گیا[1]

ایک طرف پریاں اپنے کنھیا کو، جوگنیں اپنے جوگی کو ڈھونڈھ رہی تھیں، دوسری طرف خدامِ شاہی اپنے سلطانِ عالم کی زیارت کے لیے اور بادشاہ کے چیلے اپنے گرو کے درشن کے لیے بے چین ہو رہے تھے، کہ یکایک حضرت جوگی کے بھیس میں نمودار ہوئے

خوش آیند ایسا تھا حضرت کا جوگ　　کہ تھا حسنِ یوسف کو جس سے بروگ
کرامت یہ رکھتا تھا جوگی نئی　　ہر اک خانۂ دل تھا اس کی منڈھی

زلفوں کی لٹیں کھلی ہوئی، جسم پر سچے موتیوں کی راکھ کا بھبھوت، گلے میں موتیوں کا مالا اور لال ڈوروں کی سیلی، سر پر سلطان بند، کانوں میں ہیکر کی بجلیاں، بدن میں شنجرفی جوڑا ۔

---

[1] یہ پوری غزل گیارہ شعر کی ہے اور مثنوی افسانۂ عشق میں شامل ہے ۔ ملکہ سیم تن اپنے محبوب، شاہزادۂ ماہ پیکر، کی آمد کا انتظار کرتے کرتے یہ غزل پڑھنے لگتی ہے (افسانۂ عشق ص ۱۴۸-۱۴۹)

ادیب

جب اس طرح حضرت نمایاں ہوئے — دعا دی ہر اک خادم خاص نے
زمانے میں بابا بھلا ہو ترا — سلامت رہے تو جہاں میں سدا
خدا ہفت کشور کا راجا کرے — تو خوش خوش جہاں میں براجا کرے
سدا مہرباں حق تعالےٰ رہے — ہمیشہ ترا بول بالا رہے

جوگنیں جو اپنے کنہیا کو ہر طرف ڈھونڈتی پھرتی تھیں، اب سمٹ کر جوگی جی کے گرد جمع ہو گئیں اور "جے بجنبو رہے جانِ عالم" اور "جانِ عالم کی جے" کے نعرے لگا کر خوشی کے مارے ناچنے گانے لگیں۔ "رادھے رادھے" کی دھوم مچ گئی۔ اسی طرح گاتی ناچتی وہ سب جوگی جی کے ساتھ چلیں۔ یکایک جوگی جی پھر غائب ہو گئے اور جوگنیں ان کو ہر طرف ڈھونڈھنے لگیں:۔

کوئی جوگن آپس میں کہنے لگی — "میں جگیا کے کارن دوانی بھئی"
"یہ جگیا جو درشن کو ترسات ہو — جیا مورا بیاکل بھیو جات ہو"
کبھی کہتی تھی یوں کوئی لالہ فام — "ڈگر بیچ بھٹکت ہوں میں رام رام"

اتنے میں خبر ملی کہ جوگی جی شہنشاہ منزل میں رونق افروز ہیں۔ یہ سنتے ہی جوگنوں کا پرا اُدھر چل کھڑا ہوا۔ لیکن وہاں پہونچ کر کیا دیکھتی ہیں کہ اور سب تو حاضر ہیں مگر جوگی جی نہیں ہیں۔ اب اُن کی بے قراری اور بڑھ گئی۔ وہ ایک ایک سے اپنے جوگی کا پتہ پوچھ رہی تھیں اور لوگ اُن کو تسلّی دے رہے تھے کہ اتنے میں حضرت سلطان عالم محفل میں داخل ہوئے۔ سلامی کی شلکیں چلنے لگیں۔ ان کو دیکھ کر جوگنیں اپنا غم بھول گئیں اور خوشی کے عالم میں ناچنے لگیں۔

ہوا اور ہی بزم عشرت کا ڈھنگ — ہر اک سمت ہونے لگا ناچ رنگ
وہ چھائی ہوئی بوستاں پر گھٹا — وہ کم کم ترشح وہ ٹھنڈی ہوا
وہ بادل میں برق تپاں کی چمک — وہ کالی گھٹا میں نمایاں دھنک

اس موقع پر بادشاہ نے بھی کوئی چیز گائی۔

وہ حضرت کا گانا عجب حسن کا　　وہ آواز پیاری وہ لَے کا مزا
جو گلشن میں حضرت ہوئے نغمہ زن　　لگی وجد کرنے عروسِ چمن[۱]

واجد علی شاہ کے جوگی بننے کے اس جشن میں سری کرشن کی راس لیلا کا عکس صاف نظر آتا ہے جیسا کہ آگے کے بیان سے واضح ہوگا۔

۱؎ مثنوی جلوۂ اختر ص ۱۷-۲۳

دوسری منزل: واجد علی شاہ کے ایجادی رہس

رہس کی حقیقت | واجد علی شاہی رہس کا بیان کرنے سے پہلے رہس کی حقیقت واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ رہس، اصل میں، راس، ہے جو سری کرشن کی لیلاؤں میں سے ایک لیلا ہے۔ حقیقت اس کی یہ ہے کہ ایک مرتبہ کرشن نے گوپیوں سے وعدہ کیا کہ آئندہ جاڑوں کی راتوں میں تمھاری تمنا پوری کروں گا۔ جب جاڑوں کی دلکش راتیں آئیں تو کرشن برندابن میں بانسری بجانے اور عورتوں کا دل لبھانے والے گیت گانے لگے، جن کو سُن کر گوپیاں جذبات کی شدّت سے بے قابو ہو گئیں اور اپنے اپنے کاموں کو ادھورا چھوڑ کر فوراً برج سے چل کھڑی ہوئیں۔ کرشن نے ان سے برج واپس جانے کو کہا تو وہ سب بہت رنجیدہ ہوئیں۔ آخر ان کی خوشی پوری کرنے کے لیے کرشن جمنا کے کنارے اُن کے ساتھ کھیلنے اور تفریح کرنے لگے۔ ان کی محبت پاکر گوپیوں کے دل میں یہ غرور پیدا ہو گیا کہ ہم سے زیادہ خوبصورت، نیک صفات، اور خوش قسمت کوئی عورت دنیا میں نہیں ہے۔ ان کا یہ غرور ڈھانے کے لیے کرشن یکایک غائب ہو گئے۔

جب کرشن کہیں نظر نہ آئے تو گوپیاں بے حد پریشان ہوئیں اور اپنے محبوب کے گُن گاتی ہوئی ان کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرنے لگیں۔ جنگل کے درختوں سے اور ان میں لپٹی ہوئی بیلوں سے کرشن کا پتہ پوچھتی پھریں۔ پھر کرشن کی یاد میں محو ہو کر اُن کے کارناموں کی نقلیں کرنے لگیں۔ کاتک کی پورن ماشی کی رات تھی۔ جتنبک چاند کی روشنی باقی رہی وہ اسی طرح کرشن کی لیلاؤں کی نقلیں کرتی ہوئی ان کو ڈھونڈتی پھریں۔ پھر سب پلٹ آئیں اور جمنا کے کنارے بیٹھ کر کرشن کے گُن

گانے اور ان کی منت کرنے لگیں۔ وہ اسی طرح غمگین بیٹھی تھیں کہ یکایک کرشن ان کے سامنے نمودار ہو گئے۔ گوپیاں اُن کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے بے اختیار ہو گئیں اور کرشن ان کو ساتھ لے کر جمنا کے کنارے گھومنے پھرنے لگے۔ ناز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں اور کرشن ان کے ساتھ کھیل تماشے کرتے رہے۔ گوپیاں ایک دوسری کا ہاتھ پکڑ کر گھیرا بنا کر کھڑی ہو گئیں اور کرشن بھی اس حلقے میں اس طرح شامل ہو گئے کہ ہر دو گوپیوں کے بیچ میں ایک کرشن نظر آتے تھے۔ ہر گوپی سمجھ رہی تھی کہ کرشن اسی کے پاس ہیں۔ گوپیوں اور کرشنوں کا یہ حلقہ بڑے دل کش انداز سے ناچنے گانے لگا۔ بےشمار دیوتا اپنی بیویوں کے ساتھ بادلوں پر بیٹھ کر آسمان سے اس راس لیلا کا نظارہ کرنے لگے اور نقارے بجا بجا کر پھول برسانے لگے۔ راس منڈل میں ناچتی گاتی ہوئی گوپیوں کی تانوں سے ساری دنیا گونج اٹھی۔ جب جذبات کے جوش میں گوپیاں بے قابو ہو گئیں اور ان کو تن بدن کا ہوش نہ رہا تو جتنی گوپیاں تھیں اتنے کرشن بن گئے اور ہر گوپی کے ساتھ کرشن نے رات بسر کی۔[1] صبح سویرے سب گوپیاں اپنے اپنے گھر گئیں۔ برج کے مرد یہی سمجھتے رہے کہ ان کی عورتیں رات کو گھر ہی میں رہیں۔[2]

وشنو پران میں جزئی اختلاف کے ساتھ راس لیلا کا بیان تقریباً اسی طرح کیا گیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ہر گوپی کرشن کے پہلو میں کھڑی ہونا چاہتی تھی اور ناچ

۱؎ اسی حکایت کی بنا پر سودا کہتے ہیں:

نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اُس کو نہ دیکھا ہو
کنھیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا وہ ہرجائی

۲؎ شریمد بھاگوت۔ اردو ترجمہ

کا حلقہ نہیں بننے پاتا تھا اس لیے کرشن نے ہر گوپی کا ہاتھ پکڑ لیا اور جب اس لمس کے اثر سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں تو حلقہ بن گیا۔ اس کی شرح یوں کی گئی ہو کہ حلقہ بنانے کیلئے کرشن نے ہر گوپی کا ہاتھ پکڑ کے اس کی جگہ پر کھڑا کر دیا۔ ہاتھ سے ہاتھ مس ہونے کا اثر یہ ہوا کہ گوپیوں کے حواس جاتے رہے اور ہر گوپی نے اپنے پاس والی گوپی کا ہاتھ کرشن کا ہاتھ سمجھ کر پکڑ لیا۔ اب ناچ شروع ہوا۔ گوپیوں کی چوڑیاں بجنے لگیں، اور موسم کی دل آویزیوں کے گیت گائے جانے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب کرشن آگے بڑھتے تھے تو سب اُن کے پیچھے چلتی تھیں اور جب پیچھے پلٹتے تھے تو اُن کے مقابل ہو جاتی تھیں۔ آگے بڑھنے اور پیچھے پلٹنے میں وہ کرشن کے قدموں کا ساتھ دیتی تھیں۔ جب کرشن اس طرح گوپیوں کے ساتھ کھیل کود کرتے تھے تو گوپیوں کو ان کی جدائی میں ایک ایک لمحہ ہزاروں سال کے برابر معلوم ہوتا تھا اور وہ اپنے اپنے شوہروں، باپوں اور بھائیوں کی ممانعت کے باوجود رات کو اپنے محبوب کرشن کے ساتھ کھیلنے چلی جاتی تھیں[1]۔

بعض دوسری کتابوں میں ہو کہ راس کے ناچ میں کرشن حلقے کے بیچ میں بھی ہوتے تھے اور ہر گوپی ان کو اپنے پہلو میں بھی دیکھتی تھی اور اپنے سامنے بھی[2]۔

راس لیلا میں ناچنے والوں کی تعداد کسی قدیم مصنف نے مقرر نہیں کی ہو سوا اس کے کہ وہ چونسٹھ سے زیادہ نہ ہونا چاہیے۔ برہمہ ویورت کے راس منڈل میں رادھا کے ساتھ گوپیوں میں سے ان کی چھتیس نہایت خاص سہیلیاں ہیں، لیکن ہر گوپی کے ساتھ اُن سے کمتر درجے کی ہزاروں خاتونیں ہیں اور اس پورے مجمع میں کوئی ایسی

---

[1] وشنو پران (انگریزی ترجمہ) ص ۵۳۳ - ۳۳۵

[2] وشنو پران (انگریزی ترجمہ) ص ۵۳۴ فٹ نوٹ

نہیں ہے جس کے ساتھ کرشن نہ ہوں[1]۔

ان مختلف بیانوں کے نتیجے میں راس منڈل کا جو تصوّر عام طور پر مسلّم ہو گیا ہے وہ ایک حلقے کا ناچ ہے جس میں جتنی گوپیاں ہیں اتنے ہی کرشن ہیں۔ اس طرح کے حلقے میں ہر گوپی کے پہلو میں ایک کرشن ہیں اور حلقے کے بیچ میں ایک کرشن کھڑے بانسری بجا رہے ہیں اور رادھا اُن کے سامنے ناچ رہی ہیں۔

راس لیلا کے مختلف تصوّرات | ہندوستان کے بڑے سے بڑے کویوں اور رشیوں نے سری کرشن کے اس عظیم رقص کو جو "راس" کہلاتا ہے، بڑی احتیاط سے بیان کیا ہے۔ اس وجہ سے برندابن اور برندابن کے کرشن اور ان کی رفیق لڑکیاں اور اُن کی محبت، کھیل اور ناچ ہندوستان کے لوگوں کے دماغ پر چھا گئے ہیں۔ ہندوستان کی شاعری، مصوّری، موسیقی میں، بلکہ مذہب تک میں برندابن کے محبت بھرے کرشن کے ساتھ گوپیوں کی محبت، کھیل اور ناچ سانس لے رہے ہیں۔ ہزاروں کتابیں اس معاملۂ عشق پر لکھی گئی ہیں اور مختلف شاعروں نے اپنے اپنے مذاق، جذبات اور صلاحیت کے مطابق اس کو طرح طرح پر بیان کیا ہے۔ وشنو پران میں یہ فقط ایک پاک محبت ہے جو جنگل کی معصوم اور سادہ لوح لڑکیوں کو ایک نہایت حسین، شیریں حرکات اور دلیر لڑکے کے ساتھ تھی۔ یہ فقط ایک عظیم رقص ہے جیسا یورپ کی قوموں میں اب تک موجود ہے۔ ہری ونش میں یہ نوخیز لڑکیوں کی ایک نوجوان شخص کے ساتھ دیوانہ وار محبت ہے۔ بھاگوت میں یہ جذبات میں ڈوبی ہوئی شوخ و شنگ لڑکیوں کی ایک جذباتی نوجوان کے ساتھ گہری جسمانی محبت ہے۔ برہمہ ویورت پران میں یہ کھلی ہوئی نفس پرستی ہے۔ اس طرح معصوم، سادہ لوح، محبت کرنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کا خوشی خوشی ناچنا

---

[1] وشنو پران (انگریزی ترجمہ) صفحہ ۵۳۴ تا صفحہ ۵۳۵ فٹ نوٹ

اور کھیل کود کر نازمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ انتہائی شرمناک ہوس پرستی میں تبدیل کر دیا گیا۔[1]

بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا میں ہندوستان کے نامور مفکر سوامی دویکانند نے راس لیلا کو سری کرشن کی زندگی کا ایک واقعہ نہیں مانا اور اس کو ایک ایسی عظیم تمثیل قرار دیا جس کا سمجھنا بے حد مشکل ہے اور جو صرف ان لوگوں کی سمجھ میں آ سکتی ہے جن کی عفت اور پاکیزگی کمال کے درجے تک پہونچ چکی ہو اور جو محبت میں دیوانے اور عشق کے جام سے سرشار ہو رہے ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ گوپیوں کی محبت بے لوث اور بے غرض محبت کی معراج ہے۔ اُن کے غمِ عشق اور دردِ محبت کو کون سمجھ سکتا ہے! وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ شخصی اور غیر شخصی خدا کے درمیان جو نزاع ہے اس کا واحد حل گوپیوں کی اس محبت ہی کے ذریعہ سے ملا ہے۔[2] سوامی جی نے اپنے اس قول کی وضاحت نہیں کی۔ معلوم نہیں کہ اس سے ان کا کیا مطلب تھا۔

ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی نے اپنی ایک کتاب میں راس لیلا پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ بھی اس کو ایک گہری اور نازک تمثیل قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اس تمثیل کی تفصیلی شرح لکھی ہے اور اُن کے خیال میں مذہب اور فلسفے کے جو نکتے اس میں پوشیدہ ہیں اُن کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کرشن سے گوپیوں کی خود فراموشانہ محبت انسان اور خدا کے درمیان انتہائی گہرے رشتۂ اتحاد کو ظاہر کرتی ہے۔ گوپیوں سے محدود انسان کی خواہشیں اور دل بستگیاں مراد ہیں، اور کرشن شعورِ محض، حسنِ مجرد اور راحتِ روحانی کی علامت ہیں۔[3]

1۔ سری کرشن کے حالات و تعلیمات، (بزبان انگریزی) ص ۶۲-۶۴

2. Lecture on The Sages of India.

3. The Lord of The Autumn Moons. R. K. Mukherjee Bombay, 1957

اس طرح راس لیلا، جو پہلے نفس محبّت کی بلندی سے اترتے اترتے خواہش پرستی کی پستی تک پہونچ گئی تھی، اب ان نئی تعبیروں کی مدد سے انتہائی بلندی کی طرف جا رہی ہے۔

راس لیلا کی عظمت | ہندوؤں میں راس لیلا کو ایک مذہبی تقدس حاصل ہے۔ شریمد بھاگوت میں ہے کہ راس لیلا کو جو کوئی عقیدت مند کے ساتھ پڑھتا یا سنتا ہے، اس کو بھگوان کی اعلیٰ بھکتی حاصل ہوتی ہے اور وہ نفسانی خواہشوں سے نجات پا جاتا ہے۔[1]

سنگھاسن بتیسی میں ہے کہ

"ایک دن راجا بکرما جیت نے خوش ہو کر راس منڈلی کے پردھان کو آگیا دی کہ یہ کاتک دھرم کا مہینا ہے۔ اس میں کچھ ہر کا بھجن من لگا کر کیا چاہئے۔ سرد پونوں کو ٹھاکر کی راس لیلا کر۔ پردھان نے راجا کی آگیا پائے دیس دیس کے راجا اور پنڈتوں کو نیوتا بھیج بلا یا اور جتنے نگر کے جوگی تھے اُن کو بھی خبر دے طلب کیا اور جتنے دیوتا تھے اُن کو بھی منتروں سے آباہن کر کے بلایا۔ رہس ہونے لگا۔"[2]

رہس کے جلسے میں شرکت کے لیے مختلف ملکوں کے راجا، پنڈت، جوگی اور دیوتا بلائے گئے اور اس عظیم الشان، اور مقدّس محفل میں رہس کا جلسہ کیا گیا۔ اس سے رہس کی مذہبی اہمیت اور عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

میاں نظیر کا بیان | بعض مقامات پر کاتک کے مہینے میں راس لیلا کی شبیہہ پیش کی جاتی ہے۔ میاں نظیر اکبر آبادی نے اپنی نظم "کنھیا جی کی راس" میں اس کی پوری کیفیت دکھا دی ہے۔ وہ نظم یہاں نقل کی جاتی ہے۔

---

[1] شریمد بھاگوت (اردو) ص ۱۰۸۵ [2] سنگھاسن بتیسی ص ۶۴-۶۵

کنھیا جی کی راس

کیا آج رات فرحت و عشرت اساس ہے — ہر گل بدن کا رنگین و زرّیں لباس ہے
محبوب دلبروں کا ہجوم آس پاس ہے — بزمِ طرب ہے، عیش ہے، پھولوں کی باس ہے
ہر آن گوپیوں کا یہی مکھ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہے

بکھرے پڑے ہیں فرش پہ منقش اوڑنی — بجتے ہیں تال گھنگھرو و مردنگ و خنجری
سکھیاں پھر رہی ہیں ایسی کہ جوں حور اور پری — سن سن کے اس ہجوم میں موہن[1] کی بانسری
ہر آن گوپیوں کا یہی مکھ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہے

آئے ہیں دھوم سے جو تماشے کو گل بدن — گویا کہ کھل رہے ہیں گلوں کے چمن چمن
کرتے ہیں نرت[2] کنج بہاری[3] بہ صد برن[4] — اور گھنگھروؤں کی سن کے صدائیں چھنن چھنن
ہر آن گوپیوں کا یہی مکھ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہے

پہونچے ہے آسماں تئیں مردنگ کی گمک — آواز گھنگھروؤں کی قیامت جھنک جھنک
کرتی ہے مست دل کو مکٹ کی ہر اک جھلک — ایسا سماں بندھا ہے کہ ہر دم للک للک

---

۱ موہن: موہ لینے والا۔ مراد کرشن — ۲ نرت: ناچنا۔ بھاؤ بتانا
۳ کنج بہاری: کنجوں میں پھرنے والا۔
۴ برن: طریقہ: ہیئت۔

ہر آن گوپیوں کا یہی سکھ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہے

حلقہ بنا کے کرشن جو ناچیں ہیں ہاتھ جوڑ — پھرتے ہیں اس مزے سے کہ لیتے ہیں دل مروڑ
اگر کسی کو چومیں ہیں دیں ہیں کسی کو چھوڑ — یہ دیکھ دیکھ کرشن کا آپس میں جوڑ توڑ

ہر آن گوپیوں کا یہی سکھ بلاس ہو
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہو

ناچیں ہیں اس بہار سے بن ٹھن کے نندلال[۱] — سر پر مکٹ براجے ہو، پوشاک تن پہ لال
ہنستے ہیں چھیڑتے ہیں، ہر اک کو دکھا جمال — سکھیوں کے ساتھ دیکھ کے یہ کانھ[۲] جی کا حال

ہر آن گوپیوں کی یہی سکھ بلاس ہو
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہو

ہو روپ کرشن جی کا جو دیکھو بہت انوپ[۳] — اور اُن کے ساتھ چمکے ہو سب گوپیوں کا روپ
تہنا بیاں پہ چھینٹیں ہیں گویا کھل رہی ہو دھوپ — اس روشنی میں دیکھ کے وہ روپ اور سروپ

ہر آن گوپیوں کا یہی سکھ بلاس ہو
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہو

ہنستی ہوئی جو پھرتی ہیں ساتھ اُن کے گوپیاں — ہیں اُن میں دھا ایسی کہ تاروں میں چندرماں
کرتی ہیں کرشن جی سے ہر اک آن آن بان — آپس میں اُن کے رمز و اشارات کر کے دھیان

ہر آن گوپیوں کی یہی سکھ بلاس ہو
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہو

۱ے نند لال: نند کا لڑکا ۔ مراد کرشن — ۲ے کانھ: کنھیا، کرشن
۳ے انوپ: بے مثل

یوں یک طرف خوشی سے جو کرتے ہیں کان[1] اور یک طرف کو رادھکا جی باہزار شان
آپس میں گوپیوں کے کھلے ہیں نشان بان دل سے پسند کر کے اس انداز کا سمان

ہر آن گوپیوں کا یہی مکھ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنھیا[2] کی راس ہے

گر مان[4] لیلا دیکھو تو دل سے ہو پر بہار اور رادھے[3] جی کا روٹھنا اور کرشن[5] کی پکار
باہم کبت کا پڑھنا بہ اندوہ و بے شمار اس ہجر اس فراق پہ سو جی سے ہوشیار

ہر آن گوپیوں کا یہی مکھ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہے

لیلا یہاں تلک ہیں کہاں تک لوں اُن کا نام کرتے ہیں کشن[6] رادھے ہم ان کا اختتام
درشن انھوں کے دیکھ کے ہیں مست خاص و عام ڈنڈوت کر کے، بادۂ فرحت کے پی کے جام

ہر آن گوپیوں کا یہی مکھ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہے

اس شہر میں نظیر جو بے کس غریب ہے رہتا ہے مست حال میں اپنے بغیر مے
شب کو گیا تھا اس میں کچھ کر کے راہ طے جا کر جو دیکھتا ہے تو وہ اس سبھ ہو کر کے جے

ہر آن گوپیوں کا یہی مکھ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہے[7]

رہس کے دو شعبے | راس لیلا کا بیان جو شریمد بھاگوت سے اخذ کر کے اوپر پیش کیا گیا ہے اس سے معلوم ہو چکا ہے کہ جب کرشن یکایک گوپیوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، اور

---

[1] کان: کانھ۔ کنھیا۔ کرشن۔ [2] رادھکا: رادھا [3] ان: غرور - ناز
[4] رادھے: رادھا۔ [5] کشن: کرشن [6] گلزار نظیر صـ ۲۶۳-۲۶۵

وہ ان کے گن گاتی ہوئی ان کو ڈھونڈتی پھرتی تھیں تو وہ کرشن کی یاد میں محو ہو کر اُن کے کارناموں کی نقلیں کرنے لگی تھیں ۔ اس لیے راس لیلا میں کرشن اور گوپیوں کے حلقے کے ناچ کے ساتھ کرشن کے واقعات زندگی کی نقلیں بھی شامل ہو گئیں ۔

واجد علی شاہ بھی رہس سے یہ دونوں چیزیں مراد لیتے ہیں ۔ اُن کی کتاب بنی کا چوتھا باب جو "رہس کے بیان میں" ہے، اس میں دو فصلیں ہیں، پہلی فصل "چھتیس ایجادی رہسوں میں" اور دوسری فصل "رادھا کنھیا کے دو طرح کے قصوں میں" ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ واجد علی شاہ 'رہس' کے لفظ سے کبھی حلقے کا ناچ مراد لیتے ہیں اور کبھی کرشن کے واقعاتِ زندگی کی تمثیل ۔ ان دونوں چیزوں میں امتیاز کرنے کی غرض سے ایک کو رہس کا ناچ اور دوسری کو رہس کا ناٹک یا کھیل یا جلسہ کہہ سکتے ہیں ۔ لفظ 'رہس' کے یہ دونوں مفہوم اگر نظر میں نہ ہوں تو واجد علی شاہی رہس کے بارے میں غلط فہمیاں ناگزیر ہیں ۔

واجد علی شاہ نے جن چھتیس رہسوں کا ذکر کیا ہے وہ سب حلقے کے ناچ کی مختلف صورتیں ہیں، لیکن ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اُن کو ڈرامے فرض کر کے ان میں یہ نقص نکالے ہیں کہ "اُن میں کوئی قصہ، کہانی یا پلاٹ نہیں، نہ مکالمے اور مناظر ہیں" وہ "قصہ پن سے عاری ہیں ۔ ان میں اداکاری نہیں، مکالمے نہیں، مناظر نہیں ۔ پھر انھیں ڈرامے کی تعریف میں کیسے شامل کیا جائے"[۱] ۔ ان رہسوں کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں کہ "یہ صرف موسیقی اور رقص کا امتزاج ہیں، بلکہ ان میں موسیقی کم اور مختلف اعضا کی حرکات و سکنات زیادہ ہیں"[۲] ۔ یعنی وہ صرف رقص کی مختلف صورتیں ہیں ۔ پھر ان کو ڈرامے کی تعریف میں شامل کرنے کی فکر اور اُن میں ڈرامے کے عناصر

۱،۲ نقوش، لاہور ۔ پنج سالہ نمبر ۔ فروری و مارچ ۱۹۵۳ء (مقالہ 'واجد علی شاہ کی ایک نایاب کتاب')

کی تلاش کیوں ہو! اگر وہ ڈرامے ہوتے تو اُن میں پلاٹ، مکالمے، مناظر سب کچھ ہوتا۔ صدیقی صاحب اسی سلسلے میں یہ بھی لکھتے ہیں۔

واجد علی شاہ نے رادھا کنھیا کے دو قصوں کو الگ الگ رہسوں کی شکل میں ترتیب دیا ہو۔ اور ان میں ڈرامے کے باقی عناصر بھی آ گئے ہیں[۱]۔" ذرا آگے بڑھ کر پھر کہتے ہیں:۔

"ان میں ایک قصہ پن بھی ہو، مکالمے بھی ہیں، مناظر بھی ہیں، مختلف کردار بھی ہیں، جن میں مسخرے کا کردار بھی ہے[۲]۔"

صدیقی صاحب کے منقولہ بالا اقوال خود بتا رہے ہیں کہ رہس کا ناچ اور رہس کا قصہ یا جلسہ دو جداگانہ چیزیں ہیں، لیکن اُن کے ذہن میں یہ دونوں چیزیں خلط ملط ہو کر غلط فہمیاں پیدا کر رہی ہیں۔

عشرت رحمانی بھی چھتیس رہسوں کو چھتیس ڈرامے سمجھ رہے ہیں، جیسا کہ ان کے اس قول سے ظاہر ہو:۔

"سلطان جان عالم نے یکے بعد دیگرے جو چھتیس رہس تصنیف و تمثیل کیے، وہ بھی بزم شاہی تک محدود رہے[۳]۔"

واجد علی شاہ کو رہس کے دونوں شعبوں سے بڑی دل چسپی تھی۔ انھوں نے رہس کے ناچ کی بہت سی نئی صورتیں ایجاد کیں، جن کا تفصیلی بیان اُن کی کتاب صوت المبارک کے پچھتر صفحوں میں پھیلا ہوا ہو۔ یہاں اس کا بہت مختصر خلاصہ پیش کیا جاتا ہو، جس سے رہس کے ناچ کی نوعیت کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

رہس کی بتیس صورتیں | رہس کے دو طرز تھے، ایک کی سترہ صورتیں تھیں اور دوسرے کی پندرہ۔ ان کے نام نیچے درج کیے جاتے ہیں۔

---

[۳] ادب لطیف "ڈراما نمبر" اکتوبر و نومبر ۱۹۵۴ء (مقالہ اردو ڈرامے کی ایک صدی)

پہلے طرز کی صورتیں

سلامی[1] - سیدھی ہتھ جوڑی[2] - سیدھی گل بہیاں[3] - مور مکھی[4] - مور چھل[5] - گھیرا[6] - ہتھ جوڑی چکر[7] - گل بہیاں چکر[8] - چندر مکھی[9] - سورج مکھی[10] - اکاس مکھی[11] - چوگھڑا[12] - چوکھا[13] - تاج مبارک[14] - خالی جوڑا[15] - پلٹا[16] - کنج گلیاں[17] -

دوسرے طرز کی صورتیں

مجرا[1] - گھونگھٹ[2] - مور چھتری[3] - چومک[4] - نیا[5] - راج مکھی[6] - پران سکھی[7] - اچپل[8] - جیا سکھی[9] - چتر مبارک[10] - گیان سکھی[11] - سگنا مکھی[12] - کندر[13] - مور چال[14] - نین سکھی[15] -

رہس یعنی حلقے کے ناچ کی ان تمام صورتوں میں صرف عورتیں ناچتی تھیں اور سکھیاں کہلاتی تھیں ۔

رہس کا پہلا طرز سکھیاں آگے پیچھے دو صفوں میں برابر کی تعداد میں سنجیدگی کے ساتھ خاموش کھڑی ہو جائیں - ایک صف میں کم سے کم چھ اور زیادہ سے زیادہ سولہ سکھیاں ہوں۔ چھوٹے قد والی اگلی صف میں اور بڑے قد والی پچھلی صف میں کھڑی ہوں۔ سب کے جوڑے اور پشوازیں ایک رنگ کی اور زیور ایک وضع کے ہوں۔ کرن پھول، جھپکا اور چھپے دنیاں ضرور پہنیں۔ اگر جوڑا ہو تو سب کے سروں پر ہو اور موباف[1] ہو تو سب کے سروں پر ہو۔ سب سکھیاں پھولوں کا ایک ایک ہار دونوں ہاتھوں میں لیے ہوں۔ ہر صف کے داہنی اور بائیں طرف ایک ایک جوڑ مجیروں کا ہونا چاہئے۔ نائک کو چاہئے کہ صفوں کی آراستگی اور سازوں کی ترتیب کا لحاظ رکھے

---

[1] موباف: عورتیں مانگ کا کچھ حصہ چھوڑ کر دونوں طرف کے بالوں میں چوٹی سے نیچے تک بٹ سا کپڑا لپیٹ کر اوپر سے لچکا یا زرکار چٹ لپیٹ دیتی تھیں۔ اسی کتاب میں پری خانے کی تصویر میں پریوں کے سر پر موباف دیکھے جاسکتے ہیں۔

اور صفوں کے داہنی جانب کھڑے ہو کر ناچنے گانے کے متعلق حکم دیتا رہے۔

پہلے سب سکھیاں مل کر اپنے نائک کی تصنیف کی ہوئی چیز گائیں۔ پھر اگلی صف کے درمیان سے دو سکھیاں نکل کر ذرا آگے بڑھ آئیں اور ایک سکھی دوسری سے پوچھے "اے سکھی اس رہس کا کیا نام ہے؟" دوسری سکھی مسکرا کر جواب دے کہ اس کو فلاں رہس مثلاً "سلامی رہس"، "مور پنکھی رہس"، یا "سورج مکھی رہس"، کہتے ہیں۔ اس موقع پر ایک مسخرا جامہ پہنے ہوئے، بڑا سا پگڑ باندھے ہوئے، بڑی سی توند نکالے ہوئے ظاہر ہو اور ان دونوں سکھیوں سے پوچھے کہ "تم نے کیا کہا؟" سکھیاں جواب دیں کہ "اے شخص نامعقول تجھ کو اس حماقت سے کیا حصول" اس کے جواب میں مسخرہ ایسی باتیں کرے جن سے اہل محفل خوش ہوں اور ہنسیں۔ آخر کار سکھیاں اس کو رہس کا نام بتا دیں اور اس نام کی مناسبت سے رہس کی مضحکہ خیز نقل کرے سکھیاں اس کو مار کر محفل سے نکال دیں اور اپنی صف میں شامل ہو جائیں۔ اب سب سکھیاں مل کر یہ چیز گائیں "جان عالم رہس مبارک، جُگ جُگ جیو، سدا راجو، اکھتر سنگ سکھی رہس مبارک"

جب سکھیاں یہ سب گا چکیں تب نائک تتکار یعنی حکم دینا شروع کرے پہلے تتکار پر سب سکھیاں ایک خاص انداز سے کھڑی ہو جائیں۔ اس کے بعد ہر تتکار پر اس انداز میں کوئی تبدیلی کریں اور کوئی خاص چیز گائیں اور ناچ کی کوئی صورت پیش کریں۔ آخری تتکار پر سب مل کر بلند آواز سے کہیں "جان عالم کی جے"۔ آخری تتکار کے سوا ہر تتکار میں نائک تین مرتبہ کہے "دھا، ترکٹ تک دھا" اور سم سے شروع کرے۔ آخری تتکار جس پر رہس ختم ہوتا ہے یہ ہو "تی دھی تا تھیا تا تھیا تھیا تھی" اور یہ خالی سے شروع کیا جائے۔

اس طرز کے رہس کی بعض صورتیں ہیں "جان عالم رہس مبارک جگ

جگ جیو، سدا براجو، الختر سنگ سکھی بھس مبارک" کی جگہ اس موقع پر سکھیاں یہ چیز گاتی ہیں "چلو چلو سکھی اب رہس کریں، اختر پیا کے من پر چائیں" "تاج مبارک نام کے رہس میں مسخرے کی جگہ ایک مرد معقول عمامہ باندھے ہوئے، تسبیح لیے ہوئے آتا ہو اور سکھیوں سے پوچھتا ہو کہ "تم نے کیا کہا؟" وہ جواب دیتی ہیں کہ "ہم نے کہا تاج مبارک کا رہس معلوم ہوتا ہو" یہ سنتے ہی وہ شخص تعظیم کی راہ سے عمامہ سر سے اتار کر قبلہ رو ہو کر مصنف اور ناٹک کی بقائے دولت اور درازی عمر کی دعا مانگ کر رخصت ہو جاتا ہو۔ بعض اور رہس بھی تفصیلات میں دوسرے رہسوں سے کچھ کچھ مختلف ہیں۔

رہس کا دوسرا طرز | سکھیاں ایک صف میں کھڑی ہو کر ناٹک کی تصنیف کی ہوئی چیز گائیں پھر ایک سکھی صف سے نکل کر ادب کے ساتھ عرض کرے کہ یہ فلاں رہس ہو، اور اجازت لے کر صف میں شامل ہو جائے۔ اس کے بعد ناٹک تتکار دینا شروع کرے اور سکھیاں معینہ اصول کے مطابق کام کریں اور ناچیں گائیں۔ اس طرز میں ایک موقعے پر سکھیاں ناچ کے یہ گاتی ہیں "رہس فلاں ناچو سکھی ری" ناٹک ہر تتکار میں تین دفعہ کہتا ہے "دھا دھا تر کٹ دھا" اور آخری تتکار میں جب رہس ختم ہوتا ہو یہ کہتا ہے "تر کٹ تھئی تھئی تھئی تھئی تت" اس تتکار پر سب سکھیاں بلند آواز سے کہتی ہیں "جگ جیو رہو جان عالم" اور محفل سے چلی جاتی ہیں۔ رہس کے دونوں طرزوں کی بعض صورتوں میں سکھیاں خاص انداز سے گلدستے اٹھاتی اور رکھتی ہیں اور ان کو ہاتھ میں لے کر ناچتی ہیں۔

رہس کے پہلے طرز میں سکھیوں کی دو صفیں ہوتی تھیں اور دوسرے میں ایک، یعنی پہلے طرز میں ناچنے والیوں کی تعداد دوسرے طرز سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ پہلے طرز کے رہس میں وقت بھی زیادہ لگتا تھا۔ غالباً اسی بنا پر بعض مصنفوں

نے ان دونوں طرزوں کے رہسوں کا ذکر بڑا جلسہ اور چھوٹا جلسہ کے نام سے کیا ہو۔

رہس کی چھتیس صورتیں | صوت المبارک سنہ ۱۲۶۹ھ کی تصنیف ہو۔ اس وقت اودھ کا ملک واجد علی شاہ کے زیرنگیں تھا۔ اُس کے تیئس برس بعد، جب اُن کو سلطنت سے دست بردار ہوئے بیس برس گزر چکے تھے، انھوں نے اپنی کتاب بنی[1] میں چھتیس طرح کے ایجادی رہسوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان چھتیس رہسوں میں سے اکثر کے نام نئے ہیں اور کچھ کے پرانے یعنی وہی جو صوت المبارک میں ملتے ہیں۔ پرانے ناموں میں بیشتر یہ تغیر کر دیا گیا ہے کہ ہندی لفظوں کی جگہ اُن کے ہم معنی فارسی یا عربی لفظ رکھ دیے گئے ہیں مثلاً 'مور پنکھی' کی جگہ 'طاؤس پنکھی' اور 'سورج مکھی' کی جگہ 'آفتاب مکھی'۔ معلوم نہیں کہ اس طرح ناموں کو بگاڑنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

رہس کی ان مختلف صورتوں میں بیشتر ایسی تھیں جن میں کبھی ایک سکھی دوسری سکھی کے بازو میں بازو ڈال کر، کبھی اپنا پنجہ دوسری کے پنجے سے ملا کر، کبھی اپنا ہاتھ دوسری کی کمر پہ رکھ کر اور کبھی اپنے ہاتھ سے دوسری کا بازو پکڑ کر زنجیرہ بندی کر لیتی تھیں اور حلقہ بنا کر ناچتی تھیں۔

رہس کے لیے ہدایتیں | رہس کی ہر صورت کے تفصیلی بیان کا تو موقع نہیں، صرف وہ عام ہدایتیں جو تمام صورتوں میں مشترک ہیں خود واجد علی شاہ کے لفظوں میں پیش کی جاتی ہیں:۔

"سکھیاں پشواز وغیرہ سے آراستہ ہو کر آئیں اور خاموش بیٹھ جائیں۔ سازندے ان کے ہمراہ یہ تصنیف راقم گائیں "چلو چلو سکھی اب رہس کریں اکھتر پیا کے من کو رجھائیں"۔ جس وقت راقم کا تخلص

---

[1] بنی صفحہ ۸۵

ہوں پر فوراً آکے سب سکھیاں کھڑی ہو جائیں اور جس مقام پر رہس کے واسطے صف باندھ کر کھڑا ہونا مقرر ہو چکا ہو وہاں پر صف بستہ ہموار استادہ ہوں . . . . . اور دو جوڑ چھوٹی چھوٹی جھانجھوں کے جانبین صف کے بجائے جائیں کم کم ہر رہس کے ماقبل ضرور ہو کہ راقم کی تصنیفات گائیں۔ بعدہٗ پکھاوجی کے ٹکڑے کے ہمراہ وہ نغمہ سم پر تمام کیا کریں، اور ہر رہس کے ختم کے بعد "چرنجی رہو جانِ عالم" یا "جانِ عالم کی جے" سُر میں کہا کریں اور ایک ٹکڑا دہنی جانب اور دوسرا بائیں جانب اور تیسرا بالائے ناف تمام کریں اس کی شکل یہ ہو کہ پہلے دہنی جانب دونوں ہاتھ ٹیک کر میں ہاتھ اور دوسری دفعہ بائیں جانب بھی اسی طرح سے تیسری مرتبہ ناف پر بائیں ہاتھ کی انگشت کلمہ اور انگشتِ نر ملا کر چٹکی کی صورت بنا کر رکھیں اور دہنا ہاتھ چٹکی بندھی ہوئی پیشانیوں پر لائیں۔ ایک دو تین پر کمر کو ہلائیں۔ ایک دہنے کولے پر اور دو بائیں کولے پر اور تین پھر دہنے کولے پر تمام کریں۔ اور لے تال میں گلدستے اٹھایا اور دھرا کریں۔ چکروں میں ایک دو کے قدم لیے جاتے ہیں۔ ٹکڑے پکھاوجی بولتا ہو"[1]

بعض ہدایتوں کی مزید توضیح کے لیے واجد علی شاہ کی خدمت میں ایک عرض داشت پیش کی گئی۔ جو باتیں اس عرضداشت میں دریافت کی گئی ہیں

---

[1] بنی ص ۶۹-۷۰

[2] کلکتے میں واجد علی شاہ کی چند تصنیفیں اور ان کے کتب خانے کی کچھ کتابیں دو جگہ موجود ہیں، ان کے امام باڑے سبطین آباد، مٹیا برج میں اور ایک چھوٹے سے ذخیرے، اتحاد لائبریری میں جو لوئر چیت پور روڈ پر واقع ہے۔ ان کتابوں کے دیکھنے اور ان کے متعلق ضروری یادداشتیں لکھنے کی غرض سے اکتوبر یا نومبر ۱۹۴۱ء میں میں نے نو دن کلکتے میں قیام کیا۔ (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

ان میں سے صرف دو واجد علی شاہ کے جواب کے ساتھ نقل کی جاتی ہیں۔

(۱)

سوال:۔ "چھتیس رہس ایجادی میں بعد ختم ہر رہس کے ٹکڑا لینے کی یہ ترکیب لکھی ہو (اور ایک ٹکڑا داہنی جانب اور دوسرا بائیں جانب اور تیسرا بالائے ناف ...... ایک دو تین پر کمر کو ہلائیں۔ ایک داہنے کوے پر اور دو بائیں کوے پر اور تین پھر داہنے کوے پر تمام کریں)۔ یہ ٹکڑا جلسہ کلاں میں تعلیم ہوا تھا۔ اب سب رہس ایجادی میں یہ ٹکڑا مستعمل ہو یا فقط رہس جلسۂ کلاں میں؟"

جواب:۔ "سب میں مستعمل ہو۔ غرہ جمادی الثّانی ۱۲۹۲ سنہ ہجری۔"

(۲)

سوال:۔ زبان مبارک سے ارشاد ہوا تھا کہ "رہس فلاں ناچو لکھی رہی" میں جو لفظ "رہس" ہے وہ نہ لکھی جائے۔ فقط نام رہس اور "ناچو لکھی رہی" عمل میں آئے۔ مثلاً "رہس سلام، یا رہس تسلیم، یا رہس آداب، ناچو

(بسلسلہ صفحۂ گزشتہ) اس دفت اصل عرض داشت کا ابتدائی حصہ ان دو جگہوں میں سے کہیں موجود تھا، جس کو میں نے نقل کر لیا۔ اُس کے عنوان پر یہ فارسی عبارت درج ہے:۔

"واجب العرض ضروری مفصلۂ الذیل بعزّ عرض معلّی واجب دانستہ امیدوار آنست کہ جداگانہ بہ ہر یک بحکم مبرم شرف نفاذ فرماید۔ واجب بود عرض نمود۔"

اس کے بعد وہ اندراجات ہیں جو اوپر نقل کر دیے گئے ہیں، واجد علی شاہ کے جوابات "شرح دستخط خاص" کے تحت انھیں کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ پوری عرضداشت ملتی تو اُس کو پیش کرنے والے کا نام معلوم ہو جاتا۔

لے یہ پوری عبارت اوپر چند سطر پہلے نقل کی جا چکی ہے۔ ادیب

سکھی ری" ہو۔ اس سے لفظ "رہس" نکال کر "تسلیم یا سلام یا آداب ناچو سکھی ری" کہا جائے، مگر عنایت حسین خاں مغنی نے بیان کیا ہے کہ بدون شرکت لفظ "رہس" کے بے موزوں یعنی بے تال ہوگا"۔

جواب:۔ عنایت خاں کا قول صحیح نہیں۔ غرہ جمادی الثانی سنہ ۱۲۹۱ ہجری "

جلال کا بیان | لکھنؤ کے مشہور شاعر حکیم ضامن علی جلال نے واجد علی شاہی رہس کے بیان میں ایک نظم لکھی ہے، جو یہاں نقل کی جاتی ہے:۔

"سنو صاحبو! اب رہس کا بیاں — یہ ہے اک عجب لطف کی داستاں
طبیعت ہو خوش، شعر ایسے پڑھوں — ابھی میں رہس کا سماں باندھ دوں
کہ ہوتا ہے سکھیوں کا پہلے جماؤ — غضب اُن کی صورت ستم کا بناؤ
سراپا جواہر کے دریا میں غرق — سر مو نہیں زیب و زینت میں فرق
وہ پشواز ایک ایک کی زرنگار — کہ جن میں جھلکتے تھے سونے کے تار
ٹنکی ان میں چنکی تھی اس قہر کی — کہ چٹکی دلوں میں وہ لینے لگی
کروں گوکھرو کی میں تعریف کب — کف پائے نظارہ میں گڑ گیا
کہے کوئی پٹھے کی کیا زرق برق — حضور نظر کو نہ جاتی تھی برق
بس اک بار کر کے سب اژدہام — لگیں گانے حضرت کے دُھرپد تمام
سُریلے گلے باز اُن میں کوئی — غضب کی خوش آواز اُن میں کوئی
کسی نے تو اونچے سُر ایسے بھرے — کہ زُہرہ بخوبی سماعت کرے
کسی نے جو گانے میں لی ٹکڑی — تو غنچے کے ہر گرہوں کی لذت ملی
کوئی قہر کی تان لینے لگی — کہ محفل کی وہ جان لینے لگی
بتانے لگی آنکھ سے، ہاتھ سے — پھڑکنے لگا جسم اشارے چلے
گئی بائیں کی بھی گمگ چرخ تک — مجیرے کی جوڑی بجی یک بیک

شرح دستخط خاص

هرچند از گردش فلکی و نیرنگی چرخ کجمدار انسان را چاره نیست

مگر بمقتضای سرود مستان باده دریا هندن شرکت باید نمود قتال

در محفل نکهت و عیش که اولی شبے مبارک حضور کرده ماند به الا مجاز

خالی از رنج و ملال نخواهد شد این تیغ کار حضرت سلطان

چنین است احتراز نمنمه نسخه حمدالله سنه ۱۲۶۹

واجد علی شاہ کے ہاتھ کی تحریر

بجتیں تنتکاروں کی سارنگیاں　　گرہ تے جنھوں نے دل انس و جاں
طبلچے بھی طبلے بجانے لگے　　الاپ کی جو سوجھی تو گانے لگے
بندھا دفعتہً اس طرح کا سماں　　بجانے لگے چھا بجوں تالیاں
بس اک بار وہ بیٹھے بیٹھے اٹھیں　　رہس ناچنے کو کھڑی ہو گئیں
وہ سب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے　　قیامت کے جوبن نکالے ہوئے
وہ سب مل کے چکر لگانے لگیں　　سر فرش ٹھوکر لگانے لگیں
وہ جھنکار وہ گھنگھروؤں کی صدا　　سرافیل کا صور گویا پھنکا
وہ پشواز کے دور کا دور دورہ　　وہ محفل کو چکر میں لاتا ہوا
قیامت چلی اُن کے قدموں کے ساتھ　　دیا ہاتھ میں آ کے فتنے نے ہاتھ

رہس ناچتی تھیں عجب ناز سے
زیادہ تھیں طاؤس طناز سے[1]"

بیخود کا بیان | ہادی علی بیخود لکھنوی واجد علی شاہ کے ایجاد کیے ہوئے رہسوں کی تعریف میں کہتے ہیں۔

رہس ایجاد کیے آپ نے اس خوبی کے　　طبع عالی پہ ہوئی روح کنہیا کی نثار
چار گلدستے ہیں چونک کے فروزاں اس طرح　　سامنے جن کے ہوئی جاتی ہے گل شمع بہار
واہ کیا نور کا عالم ہے رہس منڈل کا　　ہالۂ ماہ کو کرتا ہے فلک جس پہ نثار
کشتیٔ مہ کا ہے نقشہ کہ رہس نیا کا　　نشہ ہو جائے اگر دیکھ لے زاہد اک بار
نقشہ جب کھینچ کے دکھلایا رہس گھونگھٹ کا　　منھ چھپانے لگی خجلت سے عروس گلزار
یاسمن زار نظر آتا ہے باغ عالم　　طائفے ناچنے لگتے ہیں پہن کر جب ہار

---

[1] داستان غزالہ۔ حکیم اصغر علی خاں

کہتے ہیں دیکھ کے گلدستوں کا جو بن بلبل	بے خزاں گلشن عالم میں انھیں کی ہو بہار[1]

رہس کا ناٹک شروع ہونے سے پہلے رہس کا ناچ ہوتا تھا اور اُس ناچ میں اتنی دل کشی تھی کہ جن لوگوں نے اس کو خود دیکھا یا دوسروں سے اس کا آنکھوں دیکھا حال سنا انھوں نے اس کا ذکر مزے لے کر کیا ہو۔

نوروز کا جشن اور رہس

لکھنؤ کی شاہی تقریبوں میں جو ناچ گانے کی محفلیں ہوتی تھیں ان میں رہس کا ناچ بھی ہوتا تھا۔ ۱۷ رجمادی الثانی سنہ ۱۲۶۷ھ (۲۱ رجون سنہ ۱۸۵۱ء) کو نوروز پڑا جو اُس سال غیر معمولی شان و شوکت کے ساتھ منایا گیا۔ رجب علی بیگ سرورؔ لکھتے ہیں :-

"اس اثنا میں فصل کا رنگ بدلا، موسم بہار کا آیا۔ حضرت کا مزاج بحال ہوا، تفریح طبع کا خیال ہوا۔ جشن نوروزی کی تیاری کا حکم فرمایا۔ محل میں رنگ پاشی ہوئی، خوب دھوم مچی۔ پریوں اور جلسے والیوں کو نارنجی جوڑے عطا ہوئے۔ محلوں کو پکھراج کے زیور دیے گئے۔ یہ جلسہ بھی یادگار ہوا، نہایت پُر بہار ہوا۔ ارکانِ دولت و اعیانِ سلطنت زر سرخ و سفید نذر لائے، شاعروں نے قصیدے نظم کیے، سرورؔ نے چند فقرے نثر لکھ کے سنائے"[2]

جلالؔ لکھنوی کی ایک مسدس نظم ہو جس کے عنوان پر یہ عبارت درج ہو:-

"مسدس در تہنیت نوروز کہ پیشکش حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ دربیت السلطنت لکھنؤ کردہ شدہ بود"

---

[1] گلستانِ بے خزاں کلیات بیخود، مطبع کارنامہ، لکھنؤ، ۱۲۹۰ھ مطابق سنہ ۱۸۷۴ء صفحہ ۱۳۰

[2] فسانۂ عبرت، صفحہ ۹۰

کچھ عجب نہیں کہ یہ نظم اسی جشن کے موقعہ پر لکھی گئی ہو۔ اس کے صرف تین بند یہاں نقل کیے جاتے ہیں:۔

جلسے پریوں کے ہیں آراستہ ہو قیصر باغ — راجا اندر کے اکھاڑے سے بھی ہو بہتر باغ
سبز و شاداب ہو جنت کی طرح یکسر باغ — اس طرح کا تو نہیں پردۂ دنیا پر باغ
آب نیساں سے لبالب ہیں چمن کی نہریں
کوثر خلد بریں سب ہیں چمن کی نہریں

وقت تحویل کا اتنے میں برابر ہو نچا — مہر برج حمل چرخ میں آکر ہو نچا
توپوں کے چھوٹنے کا شور فلک پر ہو نچا — غلغلہ جشن کا تا گنبد اخضر ہو نچا
لوگ آداب بجالا چلے نذریں دے کر
شہ والا سے چلے خلعت پُر زر لے کر

رنڈیاں رہس مبارک کی جو تھیں سب تیار — جان عالم کی وہ تھے بولتی اٹھوائی بار
جوڑے رنگین گلوں میں وہ قیامت کے نکھار — کوئی چنچل تھی، کوئی شوخ تھی، کوئی طرار
چیزیں حضرت کی بنائی ہوئی بے حد گائیں
وجد کرنے لگی زہرہ بھی، وہ دُھر پد گائیں"

جلال کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جشن نوروز کے موقعے پر رہس کا ناچ بھی ہوا تھا۔

تیسری منزل: زمانۂ ولی عہدی میں رہس کے جلسے

پہلے جلسے کی تیاری ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ راس لیلا کے دو شعبے ہیں، جن کو رہس کا ناچ اور رہس کا ناٹک کہہ سکتے ہیں۔ واجد علی شاہ نے ولی عہدی کے زمانے میں پہلے شعبے کے سلسلے میں جو کچھ کیا، اس کا ذکر ابھی کیا جا چکا ہے۔ راس لیلا کا دوسرا شعبہ یعنی رہس

کا ناٹک بھی ان کی توجہ سے محروم نہیں رہا۔ وہی ولی عہدی کا زمانہ تھا کہ انھوں نے اس فن کے کئی استاد ملازم رکھے، جنھوں نے اپنی واقفیت فن کے مطابق، رادھا کنھیا کے ناٹک کا بہت سے بہتر کھیل کئی لاکھ روپے کے صرف سے تیار کیا۔ اس کھیل کے بارے میں واجد علی شاہ خود لکھتے ہیں:-

"ایک دن باغبان حقیقی نے گل ولالہ پر بہار کا فرش بچھایا تھا اور لوگوں کے دلوں کو فرحت و مسرت سے رشک لالہ زار بنایا تھا۔ وہ دن ایسا تھا کہ شب عقد بھی اس کی نظیر نہیں ہو سکتی، فلک سیر میں ناچ گانے کی محفل آراستہ کی گئی تھی اور پریوں کو رہس دھاری[1] تیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ واضح ہو کہ اس رہس دھاری، ایک رقص کا سامان ہو۔ ہندوؤں کے مذہب میں اس کی پرستش کی جاتی ہو اور وہ لوگ ہزاروں روپیہ اس پرستش پر صرف کرتے ہیں۔ اس میں کنھیا اور اُن کے معشوقوں کی شبیہ اور ہیئت بنائی جاتی ہو حق یہ ہو کہ جیسا رہس میری سرکار میں تیار ہوا کہیں اور تیار نہ ہوگا۔ سب پریوں کو تیار کرنا اس فن کے استادوں کا کام ہو۔ میرے سات مرد ملازم اس فن کے بانی ہوئے۔ انھوں نے کنھیا اور اُن کے معشوقوں وغیرہ کی شبیہہ تیار کی۔ اس کی تفصیل یہ ہو کہ سلطان پری نے کنھیا کی زوجۂ کلاں رادھا کی صورت بنائی اور ماہ رُخ پری کنھیا بنی، سر پر مکٹ، ہاتھ میں بانسری۔

"رہس کے لوازمات کئی لاکھ روپے میں تیار ہوئے۔ سب سامان

---

[1] صحیح لفظ، راس دھاری ہو، اس کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہو جو راس یا رہس کے جلسے میں پارٹ کرتے ہیں۔ یہاں اس کی جگہ صرف "رہس" کا لفظ ہونا چاہئے تھا۔ ادیب۔

موجود ہونے کے باوجود صرف پرستش کے 'لوازمات' اور آرائش کے تاروں وغیرہ کی خریداری میں پانچ سو روپے خرچ ہوئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یاسمن پری، عزت پری، دل ربا پری اور حور پری کنھیا کی دوسری معشوقوں کی صورت میں تیار ہوئیں، جن کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گوالینں کہتے ہیں۔ اس کا ناچ سنگیت، ارم اور چھمی کے مثل ہوتا ہو، جو مشہور ناچوں میں تالوں کے نام ہیں۔ اور کیفیت تو بس کنھیا اور رادھا کے مباحثے میں ہو جو فراق و وصال کے بارے میں ہوتا ہو۔ وہ ہندی دوہروں میں باتیں کرتے ہیں۔ چنانچہ اِدر

دوہرا:۔ مور مکٹ کٹ کا چھینی کر مرلی اُر مال

یہ بانک موہ من بسے سدا بہاری لال

دوہرا رادھا کی زبانی :۔

آؤ پیارے موہنا پلک ڈھانپ تو ہو لیوں

ناہیں دیکھوں اور کو اور نا تو ہے دیکھین دیوں

حق یہ ہو کہ میں نے ایسا جلسہ نہیں دیکھا اور یہ جلسہ صبح کو نہیں ہوتا بلکہ شام کو ہوتا ہے۔[1]

یہ شاہی رہس کے سب سے پہلے جلسہ کا بیان ہے۔

پہلا شاہی ناٹک | شاہی رہس کے اس پہلے جلسے میں جو ناٹک کھیلا گیا تھا اس کے بارے میں واجد علی شاہ کے منقولۂ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ وہ رادھا کنھیا کی داستان محبت پر مبنی تھا۔ اس کے کرداروں میں رادھا اور کنھیا کے علاوہ چار گوالینں بھی تھیں، رادھا اور کنھیا کا مباحثہ دوہروں میں ہوتا تھا، جن میں یہ دو دوہرے بھی تھے:۔

---

[1] عشق نامہ نثری فارسی صفحہ ۱۴۸–۱۵۰

"موہے مکٹ کٹ کاچھنی کر مُرلی اُر مال یہ بانک موہ من بسے سدا بہاری لال"

"آؤ پیارے موہنا پلک ڈھانپ توہے لیوں
نا میں دیکھوں اور کا نا توہے دیکھن دیوں"

واجد علی شاہ کا تصنیف کیا ہوا رادھا کنھیا کا ایک 'قصّہ' اب تک موجود ہے جس میں یہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ یہی وہ 'قصّہ' یا ناٹک تھا جو لکھنؤ کے شاہی محل میں پہلے پہل کھیلا گیا[۱]۔

عشرت رحمانی اپنے مقالے 'اردو ڈرامے کی ایک صدی' میں لکھتے ہیں:۔

"سب سے پہلے سلطان عالم نے اپنی ایک عشقیہ مثنوی افسانۂ عشق کو منظوم ناٹک کی شکل میں مرتب کیا جس کا انداز اوپیرا یا رہس کا تھا[۲]۔"

اس بیان میں 'سب سے پہلے' کا فقرہ محل نظر اور 'منظوم' کا لفظ ثبوت کا محتاج ہے۔ واجد علی شاہ نے اپنی مثنوی دریائے تعشق کا کھیل پہلے تیار کیا، افسانۂ عشق کا اس کے بعد انھوں نے یہ بھی لکھا ہے۔

"رہس کی تعداد ابتداء میں بائیس تھی . . . ان ہی میں سے دو رہس کرشن کنھیا اور رادھا کی مختصر کہانی پر مبنی تھی ہے۔ ان دونوں رہس کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ منظوم ڈراما اور اوپیرا کی تیسری پیشکش ہے جو اردو کو نصیب ہوئی ہے۔ پہلا افسانۂ عشق ہے اور دوسرا ترقی یافتہ نمونہ اندر سبھا[۳]۔"

۱؎ ضمیمۂ کتاب ملاحظہ ہو
۲؎ ادب لطیف، لاہور، ڈراما نمبر، اکتوبر و نومبر ۱۹۵۴ء ص ۵۱
۳؎ " " " " " " ص ۵۲

اس مغلق عبارت کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہو کہ اردو کا پہلا منظوم ڈراما مثنوی افسانۂ عشق پر مبنی تھا، دوسرا اندر سبھا ہو اور تیسرا کنھیا اور رادھا کی مختصر کہانی پر مبنی واجد علی شاہ کے دو رہس۔ یہ ترتیب صحیح نہیں ہو۔ تیسرے ڈرامے کو پہلی، پہلے کو دوسری اور دوسرے کو تیسری جگہ ملنا چاہیئے۔ دو رہسوں کو ایک ڈراما قرار دینا بھی سمجھ میں نہیں آتا۔

وہ اس مقالے میں کچھ آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:۔

"امانت کی اندر سبھا جو ۱۲۵۸ھ (؟) میں تصنیف ہوئی اور ۱۲۷۰ھ میں تیار ہو کر تمثیل کی گئی اور ۱۲۷۱ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی یقیناً رہس سے پہلے کی یادگار ہو"[۱]

اندر سبھا کا سال تصنیف ۱۲۵۸ھ نہیں ۱۲۶۸ھ ہو۔ اگر یہاں رہس سے شاہی رہس مراد ہے تو اندر سبھا یقیناً اس کے بعد کی چیز ہے۔

نا ٹک کا پلاٹ | اس ناٹک کا پلاٹ، تفصیلات کو حذف کرنے کے بعد، حسب ذیل ہو:۔
ایک جوگن اس غم میں مبتلا ہو کہ برسوں سے رادھا کنھیا کا ناچ نہیں دیکھا ہو۔ اس کا خادم اس غم کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہو اور کامیاب ہو جاتا ہو۔ رادھا اور کنھیا ناچتے ہیں پھر ان دونوں میں سوال جواب ہوتا ہو اور دونوں اپنی اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ رادھا کنھیا سے مرلی بجانے کی فرمائش کرتی ہیں اور جب یہ جواب ملتا ہو کہ مرلی کھو گئی تو وہ روٹھ جاتی ہیں۔ کنھیا ان کو منانے کی بہت کوشش کرتے ہیں، مگر نتیجہ کچھ نہیں ہوتا۔ آخر کار کنھیا پوجا کرتے اور دیوتا سے رادھا کو مانگتے ہیں۔ دعا قبول ہوتی ہو اور رادھا کی ناراضی دور ہو جاتی ہو۔ پھر رادھا کی فرمائش پر کنھیا مرلی کو ڈھونڈھنے نکلتے ہیں اور اس تلاش میں کامیاب ہو کر مرلی بجاتے ہوئے واپس آتے ہیں۔ مرلی کی آواز سن کر

---

[۱] ادب لطیف، لاہور، ڈراما نمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۵۴ء ص ۵۵

ناچ کی کوئی تدبیر کرنے کی غرض سے نکلتا ہو اور عفریت کے پاس جا کر اپنی غرض بیان کرتا ہو۔ عفریت غربت کو پریوں کے پاس لے جاتا ہو۔ پریاں جوگن کو بلا کر اُس کا حال پوچھتی ہیں اور عفریت کو حکم دیتی ہیں کہ جوگن کو رادھا کنھیا کا ناچ دکھا دے۔ عفریت بلند آواز سے کہتا ہو "رادھا! کنھیا! سکھیاں! ناچو منڈلے کا ناچ" رادھا اور کنھیا سب سکھیوں کے ساتھ ایک خاص انداز سے ناچتے گاتے ہوئے آگے بڑھتے اور پیچھے ہٹتے ہیں کچھ دیر بعد ناچ گانا ختم کر کے سب مل کر آواز لگاتے ہیں "راجا رام چندر کی جے"[1]

اب رادھا اور کنھیا آمنے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ آدھی سکھیاں رادھا کی طرف اور آدھی کنھیا کی طرف ہو جاتی ہیں۔ رادھا اور کنھیا میں سوال جواب شروع ہوتا ہے۔ دونوں اپنا اپنا مطلب شعروں اور دوہوں میں گا گا کر ادا کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ ناچتے اور ارتھ بھاؤ کرتے جاتے ہیں۔ اس گفتگو میں دونوں عشق و محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ اتنے میں رادھا کنھیا سے مرلی بجانے کی فرمائش کرتی ہیں اور کنھیا جواب دیتے ہیں کہ مرلی کھو گئی۔ رادھا کہتی ہیں تم مرلی کُبری[2] کو دے آئے ہو اور روٹھ کر الگ جا بیٹھتی ہیں۔ کنھیا ایک ٹھمری اپنے حسب حال گاتے ہوئے اور ارتھ بھاؤ کرتے ہوئے رادھا کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں، پاؤں پر گرتے ہیں اور ہر طرح منانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر رادھا نہیں منتیں۔ آخر رام چیرا کے مشورے سے ایک سکھی کو بیچ میں ڈال کر

---

[1] یہ ناٹک شاہی محل میں کھیلا جاتا تھا۔ شاہی خاندان کے خاص طور پر بلائے ہوئے لوگوں کے سوا کوئی اور اس کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ ایسے مخصوص نجی جلسے میں راجا رام چندر کی جے، کا نعرہ لگایا جانا واجد علی شاہ کی بے تعصبی کا ثبوت ہو۔

[2] کبرا۔ کبڑی۔ کرشن کی ایک محبوبہ جس کے ٹیڑھے جسم کو سیدھا کر کے کرشن نے اُس کو ایک حسین عورت بنا دیا تھا۔ رادھا اس سے جلتی تھیں۔

رادھا خوش ہو جاتی ہیں اور کنھیا کے سامنے ناچتی گاتی ہیں۔

ناٹک کے تماشائی | قارئین کرام! آئیے ذرا میرے ساتھ حضور باغ چلئے۔ دیکھئے یہاں جو شاہی مکانات بنے ہوئے ہیں ان میں ایک بنگلہ فلک سیر نام ہے۔ یہ وہی باغ اور وہی بنگلہ ہے جہاں آپ ولی عہد بہادر کو جوگی بنتے دیکھ چکے ہیں۔ رات کا وقت ہے، شیشے کے کنول اور رنگ رنگ کی مردنگیں روشن ہیں۔ ولی عہد بہادر تخت پر رونق افروز ہیں، ان کے پہلو میں ان کے چھوٹے بھائی مرزا سکندر حشمت بہادر تشریف رکھتے ہیں۔ تخت کے چاروں طرف پھولوں کی چادریں پڑی ہوئی ہیں اور گرداگرد پریاں بنی سنوری عطر لگائے مستی ملے ناز و انداز سے کرسیوں پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ صاحبات محل کے لیے چلمنیں پڑی ہوئی ہیں جن کے پیچھے سے وہ نظارہ کر رہی ہیں[1]۔

ناٹک کا کھیل | محفل میں ایک طرف ایک غم زدہ جوگن، ایک طرف دو پریاں، ایک طرف رادھا اور کنھیا، یہ سب کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جوگن کے سامنے اس کا خادم غربت، پریوں کے آگے ایک دیو عفریت نام اور رادھا اور کنھیا کے سامنے ان کا ملازم رام چیرا، یہ سب ادب سے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ ایک طرف چار سکھیاں جھرمٹ کیے کھڑی ہیں۔ ایک طرف چار پنہارنیں فرضی کنوئیں سے پانی بھر رہی ہیں۔ ایک طرف ایک مسافر گٹھڑی لادے لاٹھی پکڑے کھڑا ہے۔ ایک طرف چار مکھن والیاں دہی کو متھ کر مکھن نکال رہی ہیں۔ پنہارنیں اور مکھن والیاں اپنا اپنا کام لے تال کے ساتھ کر رہی ہیں اور ولی عہد بہادر کی تصنیف کی ہوئی چیزیں گاتی جاتی ہیں۔

اب باقاعدہ ناٹک شروع ہوتا ہے۔ غربت جوگن سے پوچھتا ہے کہ آپ نے کس غم میں جوگ لیا ہے۔ جواب ملتا ہے کہ چوبیس برس ہو گئے رادھا کنھیا کا ناچ نہیں دیکھا ہے، غربت

---

[1] عشق نامہ نثری فارسی صفحہ ۱۵۰

صفائی کرنا چاہتے ہیں۔ ہر سکھی تال میں لہروں کے ساتھ ناچتی ہوئی آتی ہے اور یہ صلاح دیتی ہو کہ خوب خوشامد کرو، ناگ : گڑ دہ۔ پاؤں پڑو تو رادھا مانیں کنھیا ہر مرتبہ ایک ٹھمری گاتے ہوئے رادھا کے پاس جاتے ہیں اور ادتھ بھاؤ میں منت سماجت کرتے ہیں، مگر نتیجہ کچھ نہیں ہوتا۔ تب رام چیرا کے کہنے سے کنھیا پوجا کرتے ہیں اور دانا سے رادھا کو مانگتے ہیں۔ یہ تدبیر کارگر ہوتی ہو اور رادھا جی اُٹھ کر کنھیا کے گلے لگ جاتی ہیں۔

اب سب سکھیاں کنھیا کے ساتھ مل کر گاتی ہیں۔ پھر رادھا جی کنھیا سے کہتی ہیں کہ میں خوش جبھی ہوں گی جب تم مُرلی ڈھونڈھ کر لادوگے۔ وہ مُرلی کی تلاش میں نکلتے ہیں اور ایک ایک سے پوچھتے ہیں ہماری مُرلی کسی نے دیکھی ہو۔ رام چیرا اس سوال کے ساتھ دل لگی کے انداز میں کبھی کہتا ہو ہماری مرغی کسی نے دیکھی ہو۔ کبھی کہتا ہو ہماری بھَینس کسی نے دیکھی ہو، کبھی کہتا ہو مہاراج تمھاری مُرلی کے دو سینگ بھی ہیں اور دُم بھی ہو؟ کنھیا اس کی ان باتوں پر ہنس دیتے ہیں اور اس کو گھونسا مار کر گردنی دے کر نکال دیتے ہیں۔

اس درمیان میں چار دن پنہارنیں ایک ٹھمری گا گا کر مصنوعی کنویں سے پانی بھرنے لگتی ہیں۔ کنھیا مرلی کی تلاش میں جارہے ہیں۔ راستے میں ایک مسافر ملتا ہو جو متھرا بندرابن سے آرہا ہو۔ کنھیا کے پوچھنے پر وہ بتاتا ہو کہ وہ پنہارنیں جو کنویں سے پانی بھر رہی ہیں ان میں سے ایک کے پاس تمھاری مرلی ہو۔ کنھیا اُن کے پاس جاتے ہیں۔ وہ گانے اور تال کے ساتھ پانی بھرنے میں مصروف ہیں۔ یہ منّت سماجت سے مُرلی مانگتے ہیں اور وہ انکار کرتی ہیں۔ آخر کار جس پنہارن نے مُرلی چرائی تھی وہ کہتی ہے کہ ہم کو تازہ تازہ مکھن لادو تو ہم مرلی دیں۔

اب کنھیا مکھن والیوں کے پاس جاتے ہیں اور تھوڑا سا مکھن مانگتے ہیں۔

شاهی رهس کا ایک منظر



رادها روٹه گئی هین- کنهیا ان کو منا رهے هین- سکهیان ان کو خوش کرنے اور هنسا
کی تدبیرین کررهی هین - ایک سکهی آئینه دکهاکر زبان حال سے کهه رهی هے
که زرا آئینے مین اپنی صورت تو دیکهئے

وہ دہی متھنے اور گانے میں ایسی محو ہیں کہ کچھ جواب نہیں دیتیں۔ آخر ان کی آنکھ بچا کر مکھن کی ایک تھالی اڑا لاتے ہیں اور پنہاروں کو دے کر اور اپنی مرلی لے کر اسے بجاتے ہوئے واپس آتے ہیں۔ مرلی کی آواز سن کر رادھا بے اختیار دوڑتی اور کنھیا کے گلے لگ جاتی ہیں اور خوش ہو کر کہتی ہیں مہاراج کا بول بالا رہے۔ اب تم گدی پر براجو، میں تمھارے آگے ناچتی گاتی ہوں۔ رادھا کے ناچ گانے کے بعد کھیل ختم ہو جاتا ہے یہ راگ رنگ کی صحبت اس قدر پُر لطف تھی کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی سب کی زبان سے واہ واہ کی صدا بلند تھی۔ پہر رات رہے یہ جلسہ برخاست ہوا۔ حاضرین اپنی اپنی جگہ چلے گئے اور ولی عہد بہادر نے استراحت فرمائی۔[1]

آپ نے دیکھا کہ اس رہس کے کھیل میں سب لوگوں کی بات چیت نثر میں ہوئی ہو۔ صرف رادھا اور کنھیا ایک موقعہ پر اپنی اپنی محبت کا اظہار شعروں اور دوہوں میں کرتے ہیں۔ دوسرے موقعوں پر وہ بھی نثر ہی میں باتیں کرتے ہیں۔ جو کام کیے جاتے ہیں، جیسے آنا، جانا، خوشامد کرنا، پانی بھرنا، دہی متھنا، مکھن نکالنا یہ سب لے تال کے ساتھ ارتھ بھاؤ کے ذریعے سے انجام دیے جاتے ہیں۔ یعنی ان کی نقل مطابق اصل نہیں کی جاتی بلکہ فن کارانہ حرکتوں سے ان کی طرف صرف اشارہ کیا جاتا ہو۔ اکثر موقعوں پر گانا بھی ہوتا ہو۔ اس بنا پر رہس کو ناچ ناٹک (DANCE DRAMA) اور اس کی ایکٹنگ کو قدیم سنسکرت ناٹکوں کی ابھنے سے مشابہ کہہ سکتے ہیں۔

رام چیرا کا کردار رہس کے کھیل میں ایک چیز پہلی نظر میں اعتراض کے قابل معلوم ہوتی ہو، یعنی رام چیرا کا مضحکہ خیز انداز سے کنھیا جی کی نقل کرنا اور ان کا ہنس کر ٹال دینا۔ مگر غور کرنے کے بعد اسی چیز سے اس کا ثبوت ملتا ہو کہ واجد علی شاہ ہندوستان کے

---

[1] محل خانۂ شاہی ص ۱۱۱

قدیم ناٹکوں سے کچھ واقفیت ضرور رکھتے تھے۔ سنسکرت ناٹکوں میں ایک کردار وِدُوشک کا ہوتا تھا جو دوسرے دَور کے اردو ڈراموں میں بھی بدوشک کے نام سے ملتا ہے اور اپنی مضحکہ خیز یا حماقت بھری حرکتوں سے تماشائیوں کے لیے تفریح کا سامان مہیا کرتا رہتا ہے سنسکرت ناٹکوں کا وِدوشک ناٹک یا ہیرو کا بے تکلف دوست، درباری مسخرہ اور کاروبار عشق میں ہیرو کا مشیر و مددگار ہوتا ہے۔ وہ ان پڑھ اور باتونی ہوتا ہے اور مسخرگی اور بے وقوفی کی باتیں کرتا ہے[۱]۔ اس کی صورت، پوشاک، چال ڈھال، سب کی غرض لوگوں کو ہنسانا ہوتی ہے[۲]۔ شاہی رہس میں رام چیرا کی حیثیت وہی ہے جو سنسکرت ناٹکوں میں وِدوشک کی تھی۔ قدیم سنسکرت اسٹیج کا مسلمہ دستور تھا کہ وِدُوشک کا پارٹ ہمیشہ کوئی برہمن ادا کرتا تھا، شاید اس لیے کہ تعلیم و تنقید صرف برہمنوں کا کام تھا اس کے علاوہ ناٹک کا ہیرو بالعموم کوئی راجا ہوتا تھا اور برہمن کے سوا کس کی مجال تھی کہ راجا سے بے تکلف ہنسی دل لگی کی باتیں کرے[۳]۔ واجد علی شاہ نے اس دستور کو بھی برقرار رکھا اور رام چیرا کے لیے وہ پوشاک تجویز کی جو اُس زمانے کے ان پڑھ دہاتی برہمن عام طور سے پہنتے تھے، یعنی دھوتی، مرزائی، بھینٹا انگوچھا، جنیو اور ہاتھوں میں چاندی کے کڑے۔ یہ سب چیزیں نظر میں ہوں تو رام چیرا کے کردار پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

رہس کے اداکار | رہس کے پہلے جلسے کے کُل اداکاروں کے نام تو معلوم نہیں، مگر خود واجد علی شاہ کے بیان سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ سلطان پری نے رادھا کا، ماہ رُخ پری

۱۔ سنسکرت ادب میں ڈراما (بزبان انگریزی) ا۔ د۔ جاگیردار

۲۔ ہندوستانی تھیٹر (بزبان انگریزی) چندربھان گپتا۔

۳۔ سنسکرت ادب میں ڈراما (بزبان انگریزی) ا۔ د۔ جاگیردار۔

نے کنھیا کا اور یاسمن پری، عزت پری، دل رُبا پری اور حور پری نے گوالنوں کا پارٹ کیا تھا۔ یہ گوالنیں بعد کو سکھیاں کہلانے لگی تھیں۔ یہ عورتیں کون تھیں اور وہ کس طبقے کی تھیں؟ سلطان پری ایک طوائف تھی، جس کا اصلی نام حیدری تھا۔ اس کی بڑی بہن دلبر لکھنؤ میں ناچنے گانے میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی۔ اسی نے حیدری کو گیارہ برس کی عمر میں ولی عہد بہادر کی خدمت میں نذر گزرانا تھا۔ اس وقت وہ تھوڑا بہت ناچنا گانا جانتی تھی، مگر کچھ دن کی تعلیم کے بعد اُس نے ان فنون میں غیر معمولی مہارت حاصل کرلی[1]۔ ماہ رخ پری ایک طوائف تھی، جس کا اصلی نام محبوب جان تھا۔ وہ سرود بجانے اور ناچنے میں یکتا تھی[2]۔ یاسمن پری کا اصلی نام معلوم نہیں۔ پری خانہ میں داخل ہوتے وقت وہ ناچنا گانا نہ جانتی تھی، مگر تعلیم [illegible] کے بعد اُس نے ناچ گانے میں اچھی مشق بہم پہنچائی تھی[3]۔ عزت پری کا بھی اصلی نام معلوم نہیں وہ ابتدا میں گانا ناچنا نہیں جانتی تھی۔ کچھ دن بعد وہ حاملہ ہوگئی اور عزت محل خطاب پاکر پردہ نشین ہو گئی[4]۔ دل رُبا پری ایک طوائف فیفو چونے والی کی لڑکی تھی، جس کا اصلی نام چھبّن تھا۔ تیس برس کی عمر میں ولی عہد بہادر کے یہاں محفل میں مجرا کرتے آئی اور انھیں کے گھر بیٹھ گئی[5]۔ حور پری امیرن ڈومنی کی لڑکی تھی اور اس کا اصلی نام نجّا تھا۔ وہ گانے بجانے میں مہارت رکھتی تھی اور بعد کو طوائفوں کا پیشہ کرنے لگی تھی[6]۔

شاہی رہس کے پہلے جلسے میں پارٹ کرنے والی عورتوں کا حال آپ سن چکے، اس سلسلے میں ایک بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے اور وہ یہ کہ کنھیا کا پارٹ بھی ایک

۱- محل خانۂ شاہی ص ۴۲ و ص ۱۱۶ ۔ ۲- محل خانۂ شاہی ص ۴۳

۳- " " ص ۴۱ و ص ۶۱ ۔ ۴- " " " ص ۴۱-۴۲ و ص ۶۲

۵- " " " ص ۵۲-۵۳ ۔ ۶- " " " ص ۴۲

عورت ہی نے ادا کیا تھا۔ کیا یہ محض اتفاقی یعنی بے سوچی سمجھی بات تھی؟ واجد علی شاہ نے اپنی معزولی کے بیس برس بعد اپنی کتاب بنّی میں اپنے یہاں کی رادھا کنھیا کا رہس کھیلنے والی پانچ ناٹک منڈلیوں کا ذکر کیا ہے اور ان میں پارٹ کرنے والی عورتوں کے ناموں اور کاموں کی فہرست دے دی ہے۔ ان پانچوں ناٹک منڈلیوں میں کنھیا کا پارٹ عورتوں ہی کو دیا گیا ہے[1]، حالاں کہ غربت، عفریت، رام چیرا اور مسافر کے پارٹ ہمیشہ مرد ادا کرتے تھے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ نوعمر کنھیا کی موہنی صورت دکھانے کے لیے حسین عورتوں کو زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ اور اسی سے اس مشہور مگر غلط بات کی رد ہوتی ہے کہ رہس میں خود واجد علی شاہ کنھیا بنتے تھے۔

مشہور ناول نگار مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی اپنی کتاب گزشتہ لکھنؤ میں لکھتے ہیں:۔

"بادشاہ نے سری کرشن جی کا رہس ۔ ۔ ۔ دیکھا تھا ۔ ۔ ۔ اس رہس سے ڈرامے کے طور پر ایک کھیل ایجاد کیا تھا، جس میں خود کنھیا بنتے، محذرات عصمت آیات گوپیاں بنتیں .. .. کبھی جوشِ جوانی کے جذبات سے جوگی بن جاتے، موتیوں کو جلا کے بھبھوت بنائی جاتی، جس کی بدولت فقیری میں بھی شاہی کرشمے نظر آتے[2]"

اسی کتاب میں کچھ آگے بڑھ کر یہ عبارت ملتی ہے:۔

"واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی اور رہس کے پلاٹ سے ماخوذ کر کے انھوں نے اپنا ایک ڈراما تیار کیا۔ جس میں وہ خود کنھیا جی بنتے یا عشق کے ستائے ہوئے جوگی بن کے دھونی رماتے اور بہت سی

۱۔ بنّی ص ۲۰۸ - ۲۱۷ ۲۔ گزشتہ لکھنؤ ص ۵۶ - ۵۷

عورتیں پریاں یا عاشق مزاج گوپیاں بن کے انھیں ڈھونڈتی پھرتیں۔"[1]

رہس میں واجد علی شاہ کے کنھیا بننے کی روداد بھی کی گئی ہو۔ اُن کے جوگی بننے کی حقیقت اور اس سلسلے میں جو جشن منایا جاتا تھا اس کی کیفیت اوپر تفصیل سے بیان کی جا چکی ہو، جس سے صاف طور پر معلوم ہو چکا کہ یہ جوگی بننا نہ جوشِ جوانی کا کرشمہ تھا نہ اس کو رہس سے کوئی تعلق تھا، پریوں اور گوپیوں کا جوگی جی کو ڈھونڈھتے پھرنا بھی اسی جوگیانہ جشن کا ایک جز تھا۔ رہس سے اس کا بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ اب رہا مخدراتِ عصمت آیات، کا گوپیاں بننا، تو یہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ رہس کے پہلے جلسے میں پارٹ کرنے والی عورتیں کس طبقے کی تھیں۔ بعد کے جلسوں میں بھی ہمیشہ اسی طرح کی عورتیں کام کرتی رہیں۔ ان کو "مخدراتِ عصمت آیات، کہنا کہاں تک درست ہو؟

عشرت رحمانی لکھتے ہیں:۔

"بیگماتِ شاہی کے بارے میں بھی یہ غلط بیانی کی گئی ہے کہ انھوں نے ان تماشوں میں رادھا یا پریوں کے روپ اختیار کیے۔ غالباً اس غلط فہمی کی بنا یہ ہو کہ شاہی دربار کی رقاصائیں پری محل، عشرت محل، حور محل وغیرہ کے خطابات سے سرفراز تھیں[2]۔"

اس بیان میں غلط بیانی کا جو ذکر کیا گیا ہو وہ صحیح ہو لیکن غلط فہمی کی بنا جو بتائی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہو۔ شاہی رقاصاؤں کے خطاب میں "محل" کا لفظ کبھی نہیں ہوتا، اکثر و بیشتر "پری" کا لفظ ہوتا ہو۔ مثلاً سلطان پری، ماہ رُخ پری،

۱ے گزشتہ لکھنؤ ص ۸۷

۲ے ادبِ لطیف، لاہور، ڈراما نمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۵۴ء، مقالہ اردو ڈرامے کی ایک صدی، ص ۵۲

یاسمن پری، دل رُبا پری۔

اداکاروں کی پوشاک اسٹیج کے متعلقات میں ایکٹروں کی پوشاک کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مغربی اسٹیج کی تاریخ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اس کے متعلق وقتاً فوقتاً نئے اصول بنتے رہے اور اُن کے مطابق پوشاکیں تیار ہوتی رہیں۔ یہ پوشاکیں چند قسموں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ روایتی پوشاکیں: یعنی وہ پوشاکیں جو ایک مدت تک استعمال ہوتے ہوتے مختلف کرداروں کے لیے مخصوص ہوجاتی ہیں اور جن کی اس تخصیص کا کوئی سبب نہیں بتایا جاسکتا۔

۲۔ تمثیلی پوشاکیں۔ یعنی وہ پوشاکیں جو اصلی پوشاکوں سے مختلف ہوتی ہیں، مگر خاص خاص طرح کے کرداروں کا تصوّر پیدا کرنے کے لیے علامتوں کا کام دیتی ہیں۔

۳۔ تخئیلی پوشاکیں۔ جو ان کرداروں کے لیے استعمال میں آتی ہیں جن کا وجود حقیقی نہیں، محض خیالی ہو۔ جیسے دیو، پری، بھوت، چڑیل، یا جن کو کوئی دیکھ نہیں سکتا جیسے فرشتے، جنّات، شیاطین۔ جب غیر مادّی چیزیں مثلاً روح، موت، نیکی، بدی، وغیرہ متحرک اور مادّی ہستیوں کی شکل میں پیش کی جاتی ہیں تو ان کے لیے بھی تخئیلی پوشاکیں ہی استعمال کی جاسکتی ہیں۔

۴۔ عصری پوشاکیں۔ یعنی جس زمانے میں ڈراما کھیلا جائے اسی زمانے کی معمولی پوشاکیں جو مختلف طبقوں اور پیشوں کے لوگ عام طور پر پہنتے ہیں۔

۵۔ تاریخی پوشاکیں۔ یعنی ڈرامے میں جس عہد کے کردار پیش کیے گئے ہوں اسی عہد کی مناسب حال پوشاکیں۔

ڈرامائی پوشاکوں کی اور قسمیں بھی کی جاسکتی ہیں، مگر خاص قسمیں یہی پانچ ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ پوشاکوں کے یہ تمام اصول بن جانے کے باوجود مغربی ملکوں کے اسٹیج پر کبھی ایک ہی ڈرامے کے مختلف کردار مختلف قسم کی پوشاکیں پہنتے تھے۔ کبھی ایک ہی کردار کی پوشاک کے بعض حصے ایک قسم کے اور بعض دوسری قسم کے ہوتے تھے۔ لکھنؤ کے شاہی اسٹیج پر بھی مختلف قسم کی پوشاکیں ملی جلی نظر آتی تھیں۔

واجد علی شاہ نے پہلے شاہی ڈرامے کے تمام کرداروں کی پوشاکوں، زیوروں اور دوسرے لوازم کی فہرست دیدی ہے[1] جس کو ہم اپنے طور پر ترتیب دے کر ذیل میں پیش کرتے ہیں:۔

۱۔ کنھیا۔ کارچوبی مکٹ، کارچوبی گلوبند، گھٹنا، جانگیہ، گھانگھرا، چاندی کی بانسری۔

۲ رادھا۔ لہنگا، پھریا، پیشواز، نتھ، بنیا اور تمام ہندوانے زیور

۳۔ سکھیاں۔ ڈوپٹا، پاجامہ، پیشواز، جیغہ، کلغی، سلطان بند اور کل زیور۔

۴۔ پریاں۔ پُر زر جامۂ حسن، پُر زر پاجامہ، دو کارچوبی پَر، کل زیور۔

۵۔ دیو۔ سیاہ جاکٹ، سیاہ پتلون، سیاہ دستانے، سیاہ جرابیں، مقوے کا کریہہ چہرہ، بڑے بڑے سیاہ کاغذی پر، لکڑی کا گرز۔

۶ جوگن۔ شنجرفی کفنی، تہمد، مصنوعی لمبا جٹا، کپڑے کی جھولی، تونبا، کپڑے کا بڑا سا سانپ، لکڑی کی بیراگی، بھبھوت۔

۷۔ بکھن والیاں۔ ساری، ہندوانہ زیور، لکڑی کی منھانی، ہنگی، سینی، کھریا، کلھیا۔ آخری چاروں چیزیں چاندی، گلٹ یا پیتل کی۔

۸ پنہارنیں۔ ساری، زیور، تانبے کا کلسا، ڈول، رسّی، مصنوعی کنواں اور

---

[1] بنی ص ۱۰۶-۱۰۹

گزاری۔

۹۔ مسافر۔ انگرکھا، پاجامہ، پگڑی، گٹھری، لوٹا، لاٹھی، توشہ لبستہ، چھوٹی دری۔

۱۰۔ غربت۔ انگرکھا، چکن، پاجامہ، پگڑی، پٹکا۔ سب چیزیں سفید۔

۱۱۔ رام چیرا۔ دھوتی، مرزئی، پھینٹا، انگوچھا، جھینو، ہاتھوں کے کڑے چاندی کے۔

۱۲۔ رہس والیاں۔ پُر زر ڈوپٹا، پُر زر پاجامہ، مسالے دار پُر زر پیشواز، زیور۔

یہ فہرست اُن لوگوں کے لیے ہے جو رہس کا جلسہ اپنے طور پر تیار کرنا چاہیں۔ شاہی رہس کے لیے بھی یہی سب چیزیں درکار تھیں، مگر وہ بہت بیش قیمت ہوتی تھیں۔ مثلاً دوسروں کے لیے کنھیا کا مکٹ اور گلوبند کارچوبی اور مرلی چاندی کی تجویز کی گئی ہے۔ لیکن شاہی رہس میں یہ چیزیں سونے کی ہوتی تھیں جن پر قیمتی جواہرات جڑے ہوتے تھے۔ اور اسی وجہ سے، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اُن کی تیاری میں کئی لاکھ روپیا صرف ہوا تھا۔

ان پوشاکوں کے سلسلے میں چند باتیں ذکر کے قابل ہیں۔ آج کل بڑے بڑے گھرانوں کی معزز عورتیں ساری باندھتی ہیں، مگر واجد علی شاہ کے زمانے میں اونچے طبقے کی ہندو عورتیں لہنگا پہنتی تھیں، صرف بعض نیچے طبقے کی عورتیں ساری باندھتی تھیں۔ اس لیے رہس میں رادھا کے لیے لہنگا پھریا اور مکھّن والیوں اور پنہارنوں کے لیے ساریاں تجویز کی گئی ہیں۔ دیو کی پوشاک میں جاکٹ اور پتلون کا ہونا انگریزوں کے خلاف نفرت، حقارت اور خوف کے مخلوط جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اوپر دی ہوئی فہرست میں رہس والیوں سے وہ عورتیں مراد ہیں جو واجد علی شاہ کے ایجاد کیے ہوئے حلقے کے ناچ ناچتی تھیں۔

یہ ناٹک کب کھیلا گیا | شاہی رہس کا یہ پہلا جلسہ اردو ڈرامے کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جلسہ کب ہوا۔ اس سوال کا واضح جواب تو کہیں ملتا نہیں، لیکن بعض قرینوں سے زمانے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان قرینوں کے ذکر سے پہلے ایک بات بتا دینا ضروری ہے۔ واجد علی شاہ شرع اسلام کے احکام کی پابندی میں نامحرم[1] عورتوں سے کوئی خدمت نہیں لینا چاہتے تھے اور اس لیے بالعموم وہ انھیں عورتوں کو ملازم رکھتے تھے جو اُن سے متعہ[2] کرنے پر رضامند ہوتی تھیں[3]۔ ان میں سے جو خاص طور پر منظورِ نظر ہو جاتی تھیں وہ بیگمیں کہلاتی تھیں اور ان کی عزت اور تنخواہ میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اور جو حاملہ ہو جاتی تھیں وہ محل کا درجہ پاتی تھیں اور اُن کی شان اور تنخواہ بیگموں سے بھی بڑھ جاتی تھی۔ جو عورتیں ناچنے گانے اور رہس میں کام کرنے کے لیے نوکر رکھی جاتی تھیں وہ پریاں کہلاتی تھیں ان کے نام رکھ دیے جاتے تھے جن میں 'پری' کا لفظ ضرور شامل ہوتا تھا مثلاً حضور پری، دل دار پری، امتیاز پری، سرفراز پری۔ یہ پریاں بھی ترقی کر کے بیگموں اور محلوں کے مرتبے تک پہنچ سکتی تھیں۔ محل ہو جانے کے بعد وہ سازندوں اور استادوں سے بھی پردہ کرنے لگتی تھیں اور گانا ناچنا بالکل ترک کر دیتی تھیں۔

رہس کے پہلے جلسے میں جن پریوں نے کام کیا تھا اُن کے نام اوپر لکھے جا چکے ہیں۔ یہ سب اس زمانے میں ملازم ہوئی تھیں جب ولی عہد بہادر کی عمر تقریباً بائیس سال[4] کی تھی، یعنی سنہ ۱۲۵۱ھ میں۔ ان پریوں میں ایک عزت پری تھی جو تھوڑے دن بعد حاملہ

---

[1] اسلامی شرع کے مطابق جو عورتیں کسی مرد کے سامنے بے پردہ نہیں آسکتیں وہ اس مرد کے لیے نامحرم ہیں۔

[2] کسی معین مدت کے لیے جو عقد کیا جائے وہ متعہ کہلاتا ہے۔ مسلمانوں کے بعض فرقے متعہ کو جائز اور بعض ناجائز قرار دیتے ہیں۔

[3] واجد علی شاہ کی مثنوی حزنِ اختر پر شرر لکھنوی کا مقدمہ ص ۱۱ (مطبع نول کشور، لکھنؤ، سنہ ۱۹۲۲ء)

[4] محل خانۂ شاہی ص ۳۷-۴۴

ہوکر عزّت محل ہوگئی اور ناچ گانا ترک کرکے پردے میں بیٹھ گئی[۱]۔ انھیں دنوں میں معشوق پری بھی حاملہ ہوگئی اور اس کو معشوق محل خطاب ملا[۲]۔ حمل کی مدّت گزرنے کے بعد دونوں کے یہاں صرف دو دن کے فرق سے ولادت ہوئی۔ یعنی معشوق محل کے یہاں ۷ رمحرم کو فریدون قدر اور عزّت محل کے یہاں ۹ رمحرم کو سپہر آرا بیگم پیدا ہوئیں[۳]۔ فریدون قدر بڑھ کر شاعر ہوئے۔ ان کا نام مرزا محمد ہزبر علی تھا۔ اس لیے انھوں نے ہزبر تخلص اختیار کیا۔ ان کے مطبوعہ دیوان کی ایک تقریظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ولادت ۱۲۶۱ھ کے آغاز (۱۸۴۴ء) میں ہوئی۔ سپہر آرا بیگم اسی سال ۹ رمحرم کو پیدا ہوئی تھیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُن کی والدہ عزّت محل اسی تاریخ سے نو مہینے پہلے یعنی ربیع الثانی ۱۲۶۰ھ ہجری میں ناچ گانا ترک کرکے پردہ نشین ہو چکی تھیں۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ عزّت پری ۱۲۵۹ھ ہجری میں ولی عہد بہادر کے یہاں ملازم ہوئی تھی۔ ان سب باتوں پر نظر کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لکھنؤ میں شاہی رہس کا پہلا جلسہ ۱۲۵۹ھ کے آخری حصّے میں ۱۲۶۰ھ کے ابتدائی حصّے میں ہوا۔ عیسوی سن اس وقت ۱۸۴۳ تھا۔

اس جلسے کے لیے سازوسامان کی تیاری اور اداکاروں کی تربیت میں کم و بیش ایک سال کا وقت صرف ہوا ہوگا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو قصّہ یا ناٹک اس جلسے میں پیش کیا گیا وہ ۱۲۵۸ھ اور ۱۲۵۹ھ کے درمیان میں دکھایا گیا ہوگا۔

رہس کے جلسے

رہس کے اس پہلے جلسے کے بعد ایک طولانی مدّت تک کسی دوسرے جلسے کا ذکر نہیں ملتا۔ مگر یہ قرین قیاس نہیں کہ جو جلسہ اس قدر ذوق و شوق سے لاکھوں روپے کے صرف اور مہینوں کی تعلیم و تربیت کے بعد تیار ہوا تھا اور ولی عہد بہادر کو

۱؎ ۲؎ محل خانۂ شاہی صفحہ ۶۲ ۳؎ دیوان ہزبر صفحہ ۱۵۶

بے حد پسند آیا تھا وہ ایک مرتبہ کے بعد یک قلم موقوف کر دیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ واجد علی شاہ کو موسیقی اور ناٹک کا اتنا شوق تھا کہ معزولی کے بیس برس بعد، جب کہ اُن کی آمدنی بہت محدود ہو چکی تھی، اس مد میں اُن کے یہاں تین سو اکسٹھ نفر ملازم تھے، جن کی مجموعی تنخواہ بارہ ہزار آٹھ سو روپے ماہوار تھی۔ رہس کی پوشاکیں اور کل ساز و سامان بھی انھیں کی سرکار سے ملتا تھا۔ رادھا کنھیا کا قصہ کھیلنے کے لیے پانچ ناٹک منڈلیاں[1] تھیں، جن میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد چوراسی تھی۔ استاد، سازندے اور مرد اداکار اس تعداد میں شامل نہ تھے۔ عجب تقریباً پچپن سال کی عمر اور معزولی کے عالم میں رہس کا جلسہ دیکھنے کا اتنا شوق باقی تھا تو جوانی اور ولی عہدی کے زمانے میں یہ جلسے کیوں نہ ہوتے ہوں گے۔

---

[1] اس رہس کے مصارف اور اداکاروں وغیرہ کے اس اجمالی بیان کی تفصیل کتاب کے آخری حصے میں "کلکتے میں شاہی رہس" کی سرخی کے ذیل میں ملے گی۔

وقفہ

تخت نشینی کے بعد پری خانہ برخاست ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ ہجری (۱۳ فروری ۱۸۴۷ء) کو واجد علی شاہ نے آبائی تخت سلطنت پر جلوس فرمایا۔ شاہی کارخانے میں پریوں اور بیگموں کا باہر رکھنا بے موقع معلوم ہوا، ایک دن سب کو خطابوں سے سرفراز کر کے اور بڑی بڑی تنخواہیں مقرر کر کے پردے میں بٹھا دیا[۱]۔ اس طرح پری خانہ ویران ہوگیا۔

ارباب نشاط کا نیا جلسہ جب جلوس کو دو مہینے ہو گئے اور بیگموں اور پریوں کی جدائی بہت شاق ہونے لگی تو ایک طوائف کو گھر بٹھا کر گلزار بیگم خطاب[۲] دیا۔ کچھ دن بعد بادشاہ کو خفقان کی شکایت پیدا ہوگئی اور صاحبات محل کی جدائی بہت گراں گزرنے لگی تو رفع خفقان کے لیے سولہ ناچنے گانے والی کسبی عورت کو ملازم رکھا[۳]۔ چند بیگمیں جو محل کے مرتبے پر فائز ہو کر پردے میں بیٹھ چکی تھیں، اصرار کر کے باہر نکل آئیں اور اس نئے جلسے میں شامل ہوگئیں[۴]۔

پری خانے کی دوبارہ ترتیب اس عرصے میں بادشاہ کو پری خانے کی از سر نو ترتیب اور آراستگی کا خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے قدیم خواصوں کو بلا کر کچھ کو آزاد کر دیا، کچھ کا نکاح کر دیا، کچھ کو کربلائے معلّیٰ جانے کی اجازت دیدی۔ صرف چودہ عورتوں کو جو

۱؎ محل خانۂ شاہی ص ۱۲۷-۱۲۸ ۲؎ محل خانۂ شاہی ص ۱۲۸-۱۲۹

۳؎ ؍؍ ؍؍ ص ۱۳۰ ۴؎ ؍؍ ؍؍ ص ۱۳۵

حسین اور کم سن تھیں، منتخب کر کے پریوں اور بیگموں کے زمرے میں شامل کر لیا اور ناچ گانے کی تعلیم میں لگا دیا۔ ان میں کسی کی تنخواہ پانچ سو کسی کی ہزار اور کسی کی ڈیڑھ ہزار حسب لیاقت مقرر ہوئی اور ہر ایک کی تعلیم کے لیے سات سات گانے بجانے والے استاد ملازم رکھے گئے۔ یہ سب عورتیں دن رات ناچ گانے کی تعلیم میں لگی رہتی تھیں، لیکن چونکہ محض ناواقف تھیں بعض نے تھوڑا سا اور بعض نے خوب یہ فن حاصل کیا اور بعض بالکل نابلد رہیں[1]۔

بادشاہ کی طویل بیماری پری خانے کا یہ نیا جلسہ ابھی پوری طرح تیار بھی نہ ہوا تھا کہ واجد علی شاہ تبخیر دماغ میں مبتلا ہو گئے اور اُن کی بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ اقتدار الدولہ کا بیان ہو کہ۔

> "حضرت سلطان عالم بہادر کو تبخیرے کا مرض شروع ہوا اور طبع مبارک نہایت ناساز ہوئی۔۔ ۔۔ ۔۔ ایک دن تو ۱۲۶۴ھ میں ایسا حال ہوا تھا کہ دروازے دولت خانے کے بند ہو گئے تھے اور کسی کو یقین نہ تھا کہ حضرت جانبر ہوں گے[2]۔"

۱۲۶۵ھ کا تقریباً پورا سال بیماری میں گزرا۔ صفر کے مہینے میں خفقان کی شدت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ایک دن کپڑے پھاڑ ڈالے اور اس کے دوسرے دن صبح سے شام تک آنکھیں بند کیے غش میں پڑے رہے۔ بیگموں میں کہرام مچا رہا مگر اُن کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ کون آیا اور کون گیا۔ دس مہینے گزر جانے کے بعد بھی بدن بید کی طرح کانپتا تھا، اتنا قرار نہ تھا کہ نماز بخوبی ادا کر سکیں۔ واجد علی شاہ نے ان حالات کو نظم میں یوں

---

[1] محل خانۂ شاہی ص ۱۴۱، ۱۴۲

[2] تاریخ اقتداریہ ص ۲۴۳

بیان کیا ہے:

"مجھے یاد ہجرت[1] کا ہے سال رنج — کہ تھے تب ہزار و دو صد شصت و پنج
تھے اُن روز و دن ایام ماہِ ۶،۱۰ — " " " "
زیادہ ہوا دشمنوں کا مراق — ہوا تلخ منہ مثلِ زہرِ فراق
جگر خنجرِ غم سے کٹنے لگا — ہوا ہولِ دل دم اٹکنے لگا
یہاں تک کیا پیرہن تار تار — گریباں کے پُرزے اُڑے بےشمار
ہوئی دوسرے روز کی جب سحر — ہوا غش، رہی کچھ نہ مجھ کو خبر
رہی تن میں اس درجہ طاقت قلیل — کہ مژگاں کی جنبش تھی جرِ ثقیل
کیا کچھ کسی سے نہ اس دم کلام — کشادہ نہ آنکھیں ہوئیں تا بہ شام
جو تھیں بیگمیں نیک طینت شریف — مجھے دیکھ کر ناتوان و ضعیف
لگیں رونے مانندِ ابرِ چمن — کوئی سر برہنہ کوئی سینہ زن
یہ کہرام باہم پہ ہر چند تھا — میں اپنی مصیبت میں پابند تھا
خبر کیا کہ آنسو بہاتا ہے کون — یہاں کون آتا ہے جاتا ہے کون
گیا دس مہینے کا عرصہ گزر — طبیعت سنبھلتی نہیں ہے مگر
وہی فرطِ غفلت وہی حالِ زار — لرزتا ہے تن بید ساں بار بار
قرار اس قدر بھی نہیں مطلقاً — کروں میں بخوبی نمازیں ادا

رہے گا کہاں تک یہ حالِ سقیم
کرے رحم مجھ پر خدائے رحیم"[2]

---

[1] ہجرت کا سال، سے ہجری سنہ مراد ہے۔

[2] عشق نامۂ منظوم ص ۴۹-۵۰

اودھ کے انگریز رزیڈنٹ سلیمن نے اپنے کئی خطوں میں بادشاہ کی اس طویل بیماری کا ذکر کیا ہے۔ گورنر جنرل کے سکریٹری ایلیٹ کو ۳۰ جنوری ۱۸۴۹ء (۵ ربیع الاول ۱۲۶۵ھ) کے خط میں لکھا ہو کہ بادشاہ اب بھی بہت بیمار ہیں۔ ۲۰ مارچ ۱۸۴۹ء (۲۴ ربیع الثانی ۱۲۶۵ھ) کے خط میں لکھا ہو کہ بادشاہ کی طبیعت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی میرے پچھلے خط لکھنے کے وقت تھی ۲۳ مارچ ۱۸۴۹ء (۲۷ ربیع الثانی ۱۲۶۵ھ) کے خط میں لکھا کہ بادشاہ کی حالت بدتر نہیں، بلکہ بہتر بتائی جاتی ہو۔ لیکن مشکل ہو کہ وہ گرمی کا موسم کاٹ لے جائیں۔ آخر کے دونوں خط لکھتے وقت واجد علی شاہ کی حالت ایسی نازک تھی کہ اُن کے انتقال کے بعد کے انتظامات سوچے جارہے تھے۔

سلیمن واجد علی شاہ کی بیماری کا حال گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کو بھی لکھتے رہتے تھے۔ انھوں نے ۸ مئی ۱۸۴۹ء (۱۴ جمادی الثانی ۱۲۶۵ھ) کے خط میں لکھا کہ بادشاہ جسمانی حیثیت سے بہت بیمار نہیں ہیں۔ وہ خفقان میں مبتلا ہیں اور اکثر بے بنیاد وہموں میں پڑجاتے ہیں اور ۶ ستمبر ۱۸۴۹ء (۱۸ شوال ۱۲۶۵ھ) کے خط میں لکھا کہ بادشاہ کو کوئی جسمانی تکلیف نہیں ہو، لیکن اُن کو خفقان کے طویل دورے پڑجاتے ہیں۔ اسی خط میں یہ بھی لکھا کہ بادشاہ ان دنوں نثر کی ایک ضخیم تاریخ کو جو 'حیدری' کہلاتی ہو، نظم کرنے میں مصروف ہیں۔

'حیدری' سے سلیمن کی مراد حملۂ حیدری ہو جو نثر کی کتاب نہیں، فارسی کی مثنوی ہو اور واجد علی شاہ نے اس کا آزاد ترجمہ اردو نظم میں ہیبت حیدری کے نام سے کیا ہے۔ اس مثنوی کے 'سبب تالیف' کے ذیل میں وہ اپنی بیماری کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

ہوئی جب یہ تالیف اے نکتہ سنج — تو ہجرت سے تھے بارہ سو شصت و پنج
طبیعت مری تھی نہایت علیل — نکلتی نہ تھی بسط کی کچھ سبیل

بہت دل الٹتا تھا اور رنج تھا | کہ کانٹا سا نظروں میں ہر گنج تھا
طبیعت کا بے رنگ سامان تھا | کہ آنکھوں میں صحرا گلستان تھا
نہ کچھ لطف باقی ترانے میں تھا | نہ نغمہ سراؤں کے گانے میں تھا
نہ کچھ ملک کی فکر نہ مال کی | نہ تھی کچھ خبر اپنے احوال کی
نہ کھاتا تھا کھانا نہ پیتا تھا آب | حرارت سے دل کی جگر تھا کباب
اسی طرح جب کٹ گئے ہفت ماہ | طبیعت بھی کچھ ہو چلی رو براہ

لگاتا تھا میں نظم میں اپنا دل
کہ یہ ہو نہ جائے کہیں مضمحل[۱]"

ناچ گانے سے توبہ | اس بیماری کے زمانے میں بادشاہ نے ناچ گانے سے توبہ کرلی۔ خود لکھتے ہیں :-

"اس عرصے میں جملہ منہیات وغنا وغیرہ سے بوجہ شدت مرض انکار کیا ـــــ اس وقت سے اس وقت تک کبھی گانے کی آواز میرے کان تک نہیں گئی۔ اس انکار کی وجہ سے میرا تمام پری خانہ برباد ہو گیا۔ گویے بجویے وغیرہ ملازمت سے برطرف کر دیے گئے اور سب سلسلہ ساز و سامان تلف ہو گیا[۲]۔"

بادشاہ کا یہ بیان ۱۲۶۵ھ کے اواخر کا لکھا ہوا ہے۔

دعا تعویذ | جب دوا علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو تعویذ اور جھاڑ پھونک کی تدبیریں ہونے لگیں عامل، سیانے، رمال، جوتشی، پنڈت آنے لگے اور دفع مرض کے لیے عجیب عجیب تدبیریں بتانے لگے۔ اس سلسلے میں جو شعبدہ بازیاں دیکھنے میں آئیں ان کو واجد علی شاہ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ذیل میں اس مقام کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ بیت حیدری، مطبع سلطانی، کلکتہ، ص ۱۶-۱۸ ۲۔ محل خانۂ شاہی ص ۱۵۳

"کوئی عاملوں کو بلانے لگا — جنوں ہو گیا جن بتانے لگا
مری والدہ اور کتنے محل — لگیں کہنے سننے پہ کرنے عمل
ہوئی عاملوں کی جو ہر سو تلاش — وہ آئے کہ تھی جن کو فکرِ معاش
دغا پیشہ بازی گران شگرف — اسی فن میں جن کی ہوئی عمر صرف
بچھا تھا عجب دامِ مکر و فریب — میں ان سب میں تھا طائرِ ناشکیب"[1]

یہ سب کچھ ہوا کیا مگر مرض بدستور قائم رہا اور ضعف بڑھتا گیا۔

کروں ضعف کا حال کیونکر بیاں — کہ تھا تارِ بستر تنِ ناتواں
یہ بے تاب و طاقت دلِ زار تھا — کہ کروٹ بدلنا بھی دشوار تھا
مرض نے کیا ناتواں اس قدر — کہ بند آنکھ رہتی تھی دو دو پہر
نکلتی نہ تھی کوئی صحت کی راہ — عجب حال تھا مدت پنج ماہ
اٹھاتا تھا ہر روز اک تازہ رنج — عمل ہوتے تھے شام تک پنج پنج
گئے سیزدہ روز یونہی گزر — ہوئی زیست بے آب و دانہ بسر
طبیبوں نے کیا کیا نہ روغن ملے — کہ تبخیر کی سر سے آفت ٹلے

میں بحرِ تحیر میں رہتا تھا غرق
نہ ہوتا تھا سر کی حرارت میں فرق[2]

شاہِ جن کا قضیہ جب دوا، دعا، عمل، ہوم وغیرہ سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو بادشاہ کے چند حاشیہ نشینوں نے سازش کرکے شاہِ جن کا قصہ کھڑا کیا۔ ایک کشمیری صادق علی نام کفن دوزی کا پیشہ کرتا تھا اور امجد علی شاہ کے عہد میں شاہِ جن بن چکا تھا۔[3]

۱؎ عشق نامۂ منظوم ص ۵۴۹-۵۵۰ ۲؎ عشق نامۂ منظوم ص ۵۵۱-۵۵۲
۳؎ فسانۂ عبرت ص ۸۴

اسی کو پھر شاہ جن بنایا۔ اس سلسلے میں اقتدار الدولہ لکھتے ہیں :۔

"ایک مکان نخاس میں بنا کر اس میں ایک برج بنایا اور چھت اس کی بیچ میں خالی رکھی یعنی خول رکھا اور راستہ اس چھت کے اندر جانے کا دوسرے مکان سے رکھا۔ اور ایک شخص کشمیری تھا کہ وہ نہایت ذو فنون تھا ..... اور نام اس کا صادق علی تھا، اُسے جن بنایا اور اُس نے اس برج کے خول میں دوسرے مکان سے جا کر مثل جن کے باتیں کیں [1] "

عظمت علی نامی لکھتے ہیں کہ وہ مکان محلۂ رستم نگر میں تھا [2]۔

بڑی بڑی کرامتیں اس مصنوعی شاہ جن کی طرف منسوب کی گئیں اور بادشاہ کو اس کی مدد سے کامل صحت ہو جانے کا یقین دلایا گیا۔ اس سازش میں ایسے ایسے لوگ شریک تھے اور انھوں نے مکر و فریب کا ایسا جال بچھایا تھا کہ ہوشیار سے ہوشیار انسان بھی اس میں پھنس ہی جاتا۔ واجد علی شاہ کہتے ہیں :۔

"بچھا ہو زمانے میں دام فریب — اڑے کیوں نہ ور ڈر کے مرغ شکیب
عجب گرم بازار ابلیس ہے — جدھر دیکھیے مکر و تلبیس ہے
حقیقت میں دنیا شب تار ہے — چراغ اس جگہ قلب بیدار ہو
دل صاف جن کا ہو دانائے راز — وہ سب جانتے ہیں نشیب و فراز
خدا نے کیا جن کو صاحب تمیز — وہ رکھتے نہیں حیلہ گر کو عزیز
ہر اک بات کا فہم آسان ہو — مگر کیا کرے؟ آخر انسان ہے
اثر کہنے سننے کو ہے بیش تر — کھلے کس طرح جھوٹی سچی خبر

---

[1] تاریخ اقتداریہ ص ۲۴۵ — [2] مرقع خسروی: ورق ۲۸۸ ب

خصوصاً ہو درپیش جب خوف جاں کرے صبر کیونکر دلِ ناتواں
مرض کی وہ شدت کہ زائل حواس
نہیں پاس کوئی سوائے ہراس[1]"

شاہ جن کے پردے میں بڑی بڑی نیرنگ سازیاں اور شعبدہ بازیاں ہو رہی تھیں۔ کہ ۷، محرم ۱۲۶۶ھ (۲۲ نومبر ۱۸۴۹ء) کو اشفاق السلطان امراؤ بیگم نے اس سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا[2]۔ اور صادق علی کا قصور معاف کروا کے ۷، محرم ۱۲۶۶ ہجری (۲ دسمبر ۱۸۴۹ء) کو اسے بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا[3]۔ اُس نے کل ماجرانہ صرف کہہ سنایا بلکہ کر دکھایا اور سازشیوں کے نام بتا دیے۔ ۲۵ مئی ۱۸۵۰ عیسوی (۱۲ رجب ۱۲۶۶ھ) کو بادشاہ کے حکم سے مرد عورتیں ملا کر چودہ آدمی گرفتار اور مقید ہوئے۔ جن میں اکثر بادشاہ کے خاص مصاحبوں میں شامل تھے۔ ان میں سے بارہ آدمی ۲ جون ۱۸۵۰ء (۲۰ رجب ۱۲۶۶ھ کو اور بقیہ دو آدمی ۲۳ جولائی ۱۸۵۰ء (۱۱ رمضان ۱۲۶۶ھ) کو شہر بدر کر دیے گئے[4]۔

مختصر یہ کہ ۱۲۶۴ ہجری کا کچھ آخری حصہ اور ۱۲۶۵ھ کا پورا سال اور ۱۲۶۶ھ کے ابتدائی دو تین مہینے واجد علی شاہ کی بیماری میں گزرے۔ اس زمانے میں شاہی رہس کے جلسے موقوف رہے۔

---

[1] عشق نامہ منظوم ص ۵۶۶-۵۶۷ [2] عشق نامہ منظوم ص ۵۱۵
[3] سفرنامہ سلیمن حصہ اول ص ۲۱۵ و فسانۂ عبرت ص ۸۰
[4] سفرنامہ سلیمن حصہ اول ص ۱۰۵-۱۰۶

چوتھی منزل: عہدِ شاہی میں رہس کے تین جلسے

پہلا جلسہ

مثنوی دریائے تعشق کا ڈراما

غزالہ اور ماہ رو کا قصّہ

توبہ کی شکست | سال بھر زیادہ بیمار رہنے کے بعد ۱۲۶۶ھ میں بادشاہ کو ا
سے نجات ملی تو دل بہلانے کے لیے پھر ناچ گانے کی طرف متوجہ ہوئے. خود فر

"سنو اب وہ قصّہ کہ ہوس کے غش — ہوئے جب ہزار و دو صد شصت و شش
کچھ امراض سے مجھ کو صحت ہوئی — گھٹا غم، شگفتہ طبیعت ہوئی
ٹھکانے ہوئے ہوش، ٹھہرا مزاج — ہوئی رفعِ وحشت کو فکرِ علاج
یہ کی صورتِ دفعِ رنج و عنا — کہ رہنے لگا شغلِ رقص و غنا
مغنی ملازم ہوئے بیش تر ... ...[1]"

انھیں دنوں میں بادشاہ نے دو بیٹیوں اور ایک بھانجی کی شادی رچائی. ان مے
ایک بیٹی نے مانجھے سے فراغت پا کر عین رخصتی کے دن انتقال کیا۔ اس شہزادی کی
والدہ عزّت محل، جو دقِ وسل میں مبتلا تھیں، اس صدمے کو برداشت نہ کر سکیں ا

۱؎ عشق نامۂ منظوم ص ۲۳

چالیسواں بھی نہ ہوا تھا کہ انھوں نے بھی انتقال کیا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد بادشاہ کی ایک مدخولہ عجائب خانم کا انتقال ہو گیا۔[1] ان پیہم صدموں سے وہ بہت متاثر ہوئے اور غم غلط کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ اس سلسلے میں وہ خود فرماتے ہیں:

"کہ جب کلفتِ دل زیادہ ہوئی — اداس اپنی محفل زیادہ ہوئی
چڑھائی ہوئی فوجِ اندوہ کی — روش جس کی توڑے کمر کوہ کی
روانہ ہوئے دل سے صبر و قرار — کیا تاب و طاقت نے قصدِ فرار
کہا دل نے، ہو شغل پیدا کوئی — نیا دیکھیں آنکھیں تماشا کوئی
یہ صدمے کہاں تک بھلا جھیلیے — لگے جس میں دل، کھیل وہ کھیلیے

دریائے تعشق کا ڈرامہ | اسی اثناء میں ایک دن بادشاہ اپنی مثنوی دریائے تعشق پڑھ رہے تھے کہ یکایک دل میں خیال آیا کہ اس مثنوی کا ڈراما کرنا چاہیے۔ خود فرماتے ہیں:-

"کیا ایک دن قصدِ سیرِ کتاب — لگا دیکھنے مثنوی میں شتاب
تعشق کا دریا ہے جو مثنوی — عجائب تماشا ہے جو مثنوی
نئی داستاں میری تصنیف سے — حقیقت میں باہر ہے تعریف سے
ہوا مجھ کو الہام یہ ناگہاں — کہ ہو نقل سے اصل یہ داستاں
مقرر ہوا اک جلسۂ مرد و زن — کھنچے نقشۂ قصۂ دل پسند
ملازم ہوئیں عورتیں اور مرد — مرقع ہو مانی کا بھی جن سے گرد
ہوئی اُن کو تعلیم رقص و غنا — کیا اس میں ایجاد میں نے نیا
ہزاروں تماشے ہیں ہنگام رقص — جداگانہ انواع و اقسام رقص

---

[1] عشق نامۂ منظوم ۶۰۳ - ۶۰۸ [2] عشق نامہ منظوم ۶۰۹ - ۶۱۰

سکھائے ہیں اشعار خاطر شکن | کہ موقع پہ پڑھتے ہیں وہ مرد و زن
عزیزوں کو بھی اذن میں نے دیا | وہ حاضر ہوئے اور نظارہ کیا
ہوئی جب یہ ترکیب ساری درست | طبیعت ہوئی کچھ ہماری درست[1]"

یہ مثنوی دریائے تعشق[2] کو نقل سے اصل کر دینے یعنی اس کا ڈراما بنا کر کھیل تیار کرنے کا خیال ۱۲۶۶ھ میں پیدا ہوا۔ اسی سال کچھ مرد اور عورتیں ملازم ہوئیں جن کو ناچ گانے کی تعلیم دی گئی اور مناسب موقعوں پر پڑھنے کے لیے اشعار یاد کرائے گئے۔ اس نئے کھیل کو کرشن کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہو، مگر یہ بھی رہس قرار پایا۔ واجد علی شاہ نے عشق نامۂ منظوم کی جس داستان میں اس کھیل کا ذکر کیا ہو اس کے عنوان ہی میں "تیاری رہس مبارک[3]" کے الفاظ موجود ہیں۔ رہس کے اس نئے جلسے کی تیاری میں لاکھ روپیہ ماہوار صرف ہوتا تھا۔ واجد علی شاہ خود کہتے ہیں

"نہیں صرف میں کچھ کفایت کا حرف | کہ ہر ماہ میں لاکھ ہوتے ہیں صرف[4]"

مثنوی دریائے تعشق، جس سے اس نئے رہس کا پلاٹ اخذ کیا گیا، تقریباً تین ہزار اشعار کی ایک طولانی مثنوی ہو، جس کا قصہ مختصراً حسب ذیل ہو:۔

---

[1] عشق نامۂ منظوم ص ۶۱۰-۶۱۱

[2] واجد علی شاہ نے تین طولانی رومانی مثنویاں افسانۂ عشق، دریائے تعشق اور بحر الفت اس زمانے میں کہیں جب اُن کے دادا امجد علی شاہ اودھ کے بادشاہ اور باپ ثریا جاہ امجد علی خاں ولی عہد تھے۔ اپنے بادشاہ ہونے کے کچھ دن بعد انھوں نے ان تینوں مثنویوں پر نظر ثانی کی اور اُن کے قصے میں بہت کم اور زبان میں بہت زیادہ تبدیلیاں کر کے اُن کو شائع کر دیا۔ دریائے تعشق کے دونوں ایڈیشن اور افسانۂ عشق اور بحر الفت کے صرف دوسرے ایڈیشن شاہی مطبع کے چھپے ہوئے میرے کتب خانے میں موجود ہیں اوّل۔

[3] عشق نامۂ منظوم ص ۶۰۹ [4] عشق نامۂ منظوم ص ۶۱۱۔

دریائے تعشق کا قصہ گزشتہ زمانے میں شاہ دوراں نام ایک بادشاہ تھا۔ رعایا خوش تھی اور ہر طرح کا سامان عیش مہیا تھا۔ لیکن کوئی اولاد نہ تھی جو اس کے بعد تاج و تخت کی وارث ہوتی۔ اس کے چار وزیر تھے۔ وزیر اعظم کا نام عاقل تھا اور اُس کے بھی کوئی اولاد نہ تھی۔ بادشاہ اور وزیر دونوں کو لاولدی کا بڑا غم تھا۔ بادشاہ نے شہروں شہروں سے فقیروں درویشوں کو بلا بھیجا اور اُن سے عرض حال کیا، مگر مطلب برآری نہ ہوئی۔ اسی اثنا میں ایک خدا رسیدہ درویش کہیں سے اُدھر آنکلا۔ بادشاہ اور وزیر کے دریافت کرنے پر اُس نے بتایا کہ بادشاہ کی قسمت میں صرف ایک لڑکی اور وزیر کی قسمت میں صرف ایک لڑکا ہو۔ یہ سن کر بادشاہ اور وزیر دونوں خوش ہوئے۔

درویش کے قول کے مطابق بادشاہ کے یہاں بیٹی اور وزیر کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ بادشاہ نے بیٹی کی چھٹی دھوم سے کی اور نالوں سے اس کی قسمت کا حال دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ دس برس تک اس کے لیے خطرہ ہو۔ اتنی مدت تک اس کو تہ خانے میں رکھنا، آسمان کے نیچے نہ آنے دینا۔ اس کا نام غزالہ رکھنا اور اس کی ہر خوشی پوری کرنا۔ پھر انھوں نے وزیر سے کہا کہ اپنے بیٹے کا نام گل پیرہن رکھو۔ اُس کا آغاز اور انجام سب اچھا ہوگا۔ غزالہ تہ خانے میں پرورش پانے لگی۔ بادشاہ نے اس کے لیے ایک بہت پُر فضا باغ تیار کروایا۔ جب وہ دس برس کی ہوگئی تو ایک جشن کیا گیا اور غزالہ تہ خانے سے نکل کر باغ میں آئی۔ لیکن حساب میں یہ غلطی ہوگئی کہ دس برس پورے ہونے میں ابھی دو دن باقی تھے۔

غزالہ اسی باغ میں رہتی تھی یہاں تک کہ وہ چودہ برس کی ہوگئی۔ ایک دن برسات کے موسم میں وہ جھولا جھول رہی تھی کہ ایک کنکری اس کے سینے پر گری۔ نظر جو اُٹھائی تو دیکھا کہ ایک تخت ہوا پر کھڑا ہوا ہو اور اس پر ایک شہزادہ ہو جس کی

مشکیں بندھی ہوئی ہیں اور ایک مہیب شکل کا مرد اس کو ایذا دے رہا ہو اور وہ شہزادہ کہہ رہا ہو کہ اے غزالہ میں تیرے عشق میں مرتا ہوں اور تجھ کو میری کچھ خبر نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر غزالہ اُس شہزادے پر عاشق ہو گئی اور غش کھا کر جھولے سے گر پڑی۔ جب ہوش آیا تو کنکری پر نظر پڑی اور اس پر ماہ رو، نام لکھا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ماہ رو کے فراق میں بہت بے چین رہنے لگی، مگر کسی سے اپنے عشق کا حال بیان نہیں کیا۔

انھیں دنوں میں غزالہ کی شادی ٹھہر گئی۔ نکاح کی رات کو جب دولھا اندر آیا اور رسمیں ہونے لگیں تو غزالہ نے رو رو کر خدا سے دعا کی کہ دولھا مجھے ہاتھ نہ لگانے پائے۔ یکایک سب روشنی گل ہو گئی اور ایک مہیب آواز سنائی دی۔ جب پھر روشنی کی گئی تو دولھن دولھا دونوں غائب تھے۔ یہ دیکھ کر گھر میں کہرام مچ گیا۔ ہوا یہ کہ جب غزالہ بلک بلک کر دعائیں کر رہی تھی تو جنوں کا بادشاہ سبز قبا نام اپنے تخت پر اڑا چلا جا رہا تھا۔ اس نے غزالہ کی آہ و زاری سن کر اپنا تخت اُتارا اور غزالہ اور اس کے دولھا کو ساتھ لے کر اڑ گیا اور ایک مکان میں لے جا کر رکھا۔ سبز قبا نے غزالہ کو اپنی بہن بنا لیا۔ اُس کے اصرار سے غزالہ نے اپنے دل کا حال کہہ دیا۔ اس نے ماہ رو کا سراغ لگانے کا وعدہ کیا اور غزالہ کی سفارش پر دولھا کو قید سے رہا کر کے اُس کے گھر پہونچا دیا۔

غزالہ کے یکایک غائب ہو جانے سے اس کے والدین کا بُرا حال ہو گیا۔ ایک دن اس کے باپ شاہ دوراں نے نجومیوں سے غزالہ کا حال پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی جان کی خیر ہے، مگر نا جنس سے صحبت ہو اور وہ ایک دن آ کر تم سے ملے گی۔ یہ سن کر وزیر زادہ گل پیرہن غزالہ کو ڈھونڈھنے نکلا۔ وہ جنگل جنگل پھر رہا تھا کہ ایک بستی نظر آئی۔ اُس نے موتیوں کا مالا جلا کر اس کی راکھ چہرے پر ملی اور جوگی بن کر شہر میں داخل ہوا۔ شہر بالکل ویران اور باشندے وہاں کے بہت پریشان تھے

دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اس شہر کا نام ختن ہو۔ یہاں کے بادشاہ مہرتن ک
بیٹا ماہ رو، خواب میں شہزادی غزالہ کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گیا۔ پریوں کے با
کی بیٹی لعل پری ماہ رو پر عاشق تھی مگر وہ غزالہ کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ ای
دن غصے میں آکر لعل پری ماہ رو کو اپنے تخت پر بٹھا کر اپنے باپ کے پاس لے گئی
اور سب حال بیان کیا۔ وہ روزانہ ماہ رو کو تخت پر بٹھا کر غزالہ کے مکان پر لے جاتا
اور وہاں اس پر سخت ظلم کرتا ہو مگر وہ غزالہ کے عشق سے باز نہیں آتا۔ یہ سن
وزیرزادہ بہت رویا اور شہر سے نکل کر اس نے پھر جنگلوں کی راہ لی ۔

وزیرزادہ حسن میں یکتا اور بین بجانے میں بے نظیر تھا۔ ایک دن وہ بین ب
رہا تھا کہ ایک آواز آئی "واہ! کیا خوب بین بجائی"، پھر تین تخت ظاہر ہوئے ج
پریوں کے بادشاہ سلطان پری کی تین بیٹیاں زعفران پری، ارغوان پری او
مشک بو پری بیٹھی ہوئی تھیں ۔ انھوں نے جوگی کا حال دریافت کیا اور مدد ک
وعدہ کرکے اُس کو اپنے باغ میں لے جاکے رکھا اور اس سے بین بجانا سیکھنے لگیں
جب وہ اس فن میں کامل ہو گئیں اور جوگی رخصت ہونے لگا تو پریوں نے غزا
کو ڈھونڈھ لانے کے وعدے پر اسے روک لیا۔ وہ لعل پری سے خوب واقف
تھیں اور اس کو اپنی بہن سمجھتی تھیں ۔ ایک دن انھوں نے لعل پری کی دعوت
کی اور جوگی کا بین سنوایا۔ وہ بہت خوش ہوئی اور جوگی سے اپنے گھر آنے کا
لے کر رخصت ہو گئی ۔

لعل پری تو ادھر دعوت میں شریک تھی، اُدھر سبز قبا، ہرد کی تلاش میں پھر
پھرتا اس کے باغ میں پہونچ گیا۔ وہاں ماہ رو غزالہ کا نام لے کر اپنا درد دل بیا
کر رہا تھا۔ سبز قبا نے اس کو قید سے چھڑایا اور اپنے شہر میں لا کر اس کو غزالہ سے
ملوایا۔ جب لال پری اپنے گھر واپس آئی اور ماہ رو کو نہ پایا تو غم کی شدت سے

براحال بنایا اس کے باپ لعل شہباز نے اپنے وزیر شہپال کو حکم دیا کہ ہوشیار اور تیز رو دیووں کو ہر طرف بھیج کر ہمارے قیدی کو چھڑا لے جانے والے کا پتہ لگاؤ اور فوج کی مدد سے اس کو لے آؤ۔

شہپال نے چار دیو روانہ کیے جو ماہ رو کو ہر طرف ڈھونڈھتے پھرتے تھے۔ اتفاق سے ان کا گزر سبز قبا کے باغ میں ہوا۔ وہاں بارہ دری میں غزالہ اور ماہ رو کو دیکھ کر ایک دیو نے ماہ رو کو پہچان لیا اور جا کر لعل پری کو خبر دی۔ یہ خبر سن کر لعل شہباز نے سبز قبا کو خط لکھا کہ غزالہ اور ماہ رو کو یہاں بھیج دو اور اگر نہ بھیجو گے تو میں تم سے جنگ کر کے بزور شمشیر ماہ رو کو لے آؤں گا۔ سبز قبا نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب لکھا۔ لعل شہباز جواب کو پڑھ کر بہت برہم ہوا اور فوج لے کر سبز قبا کی طرف کوچ کر دیا۔ لعل پری بھی اس کے ساتھ ہو گئی۔ ادھر سبز قبا کی جنوں کی فوج مقابلے کے لیے تیار ہو گئی۔

وزیر زادے کو پریاں کسی طرح جانے نہ دیتی تھیں۔ مگر جب یہ خبر آئی کہ لعل پری نے فوج لے کر سبز قبا پر چڑھائی کر دی ہے تو وہ چل کھڑا ہوا اور تینوں پریاں بھی اس کے ساتھ چلیں۔ یہ سب سبز قبا کے باغ میں اس وقت پہونچے جب وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ پریوں نے اپنا اور وزیر زادے گل پیرہن کا سبز قبا سے تعارف کیا اور کہا کہ ہم اپنی فوج تمھاری کمک کے لیے لائے ہیں۔ یہ سب غزالہ اور ماہ رو سے ملے اور ساتھ رہنے لگے۔ لعل شہباز دیوؤں کی فوج لے کر آ پہونچا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ آخر کار دیوؤں کو شکست اور جنوں کو فتح ہوئی۔ ماہ رو بڑی بہادری سے لڑا اور لعل شہباز سبز قبا کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ لعل پری گلزار ارم میں اپنی بہن فرخندہ پری کے پاس پہونچی اور کل ماجرا بیان کیا۔ انھوں کو باپ کے مرنے کا بہت صدمہ ہوا۔ وہ عیاری کے فن میں کامل تھی۔ ایک دن اس نے منھ پر عیاری کا روغن لگا کے

سبز قبا کی صورت بنائی اور اس کے باغ میں پہنچ کر داروے بے ہوشی اڑائی جب سب لوگ بیہوش ہو گئے تو ان کے منہ کالے کر کے ماہ رو کو پشتارے میں باندھ کر پیٹھ پر لادا اور دم بھر میں گلزار ارم پہنچ کر لعل پری کو خوش خبری سنائی۔ جب ماہ رو ہوش میں آیا تو خود کو طوق و زنجیر میں گرفتار پایا۔ لعل پری نے اس سے طعن و تشنیع کی گفتگو کی، ڈرایا، دھمکایا، مگر اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیے۔

ادھر جب غزالہ کو ہوش آیا اور اس نے ماہ رو کو نہ پایا تو اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ادھر لعل پری نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جب اپنا محبوب دوسرے پر عاشق اور مجھ سے بیزار ہو تو ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔ اس نے ایک جشن منعقد کیا جس میں تمام پریوں کے ساتھ غزالہ، ماہ رو اور سبز قبا کو بھی مدعو کیا۔ ہر طرف عیش و مسرت کا سامان تھا اور ناچ گانا ہو رہا تھا۔ اتنے میں لعل پری نے نہا دھو کے گیروا کفن پہنا، گیروی چادر اوڑھی، جسم میں کافور لگایا اور ایک ہاتھ میں خنجر اور ایک میں زہر کا پیالہ لیے ہوئے آئی اور اپنی بپتا سب کو سنا کر زہر کا پیالہ منہ سے لگانے ہی کو تھی کہ غزالہ گھبرا کر اٹھی اور پیالہ اور خنجر اس کے ہاتھ سے لے کر خود بھی اس سے میل کر لیا اور ماہ رو سے بھی میل کرا دیا۔ سب مہمان رخصت ہو کر اپنے گھر گئے اور سبز قبا ماہ رو، غزالہ اور لعل پری کو ساتھ لے کر اپنے گھر واپس گیا۔ وہاں یہ سب لوگ مل جل کر خوشی خوشی رہنے لگے۔

دو چار مہینے عیش کر کے غزالہ کو ماں باپ کے دیکھنے کی خواہش ہوئی اور سبز قبا سے اجازت لے کر یہ سب لوگ مع لعل پری کے غزالہ کے شہر میں پہونچ گئے۔ مشک بو پری در پردہ گل پیرہن سے محبت کرتی تھی۔ وہ بھی ان سب کے ساتھ چلی آئی۔ غزالہ اور گل پیرہن اپنے اپنے والدین سے ملے۔ غزالہ کی ماں ماہ رو سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ کچھ دن کے بعد غزالہ کی تجویز سے گل پیرہن کا عقد مشک بو پری سے

ہو گیا۔ اس کے بعد ماہ رو، غزالہ اور لعل پری کو ساتھ لے کر اپنے وطن ملک ختن کو روانہ ہوا۔ اُن کو رخصت کرتے وقت غزالہ کے باپ شاہ دوراں نے اپنا سارا ملک و مال ماہ رو کے نام لکھ دیا۔ ماہ رو ختن پہنچ گیا۔ شہر بھر میں اُس کی آمد کا شور مچ گیا۔ اس کے ماں باپ کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اپنی بہوؤں سے مل کر وہ بہت خوش ہوئے۔ چند روز کے بعد ماہ رو کی شادی پہلے غزالہ کے ساتھ اور پھر لعل پری کے ساتھ بڑے تزک و احتشام سے رچائی گئی۔ سال کے اندر ہی غزالہ کے یہاں ایک خوبصورت بچّہ پیدا ہوا۔ اُس کے دادا نے بڑی دھوم سے اس کی چھٹی کی، غزالہ اور ماہ رو کچھ دن اپنے گھر میں رہتے تھے اور کچھ سسرال میں، لعل پری نے اپنا ملک و مال ماہ رو کو دے دیا اور اس کے ساتھ رہنے لگی۔

جلسے کی تیاری | اس طولانی قصّے کا جلسہ یا رہس کثیر ساز و سامان کے ساتھ تقریباً سال بھر میں تیار ہوا اور ربیع الثانی ۱۲۶۷ھ میں پہلے پہل کھیلا[1] گیا۔ پہلے دن جلسے کے لیے جو تیاریاں کی گئی تھیں۔ ان کا بیان اقتدار الدولہ کی زبان سے سنئے!۔

"کہیں کسی نے کہانی غزالہ اور ماہ رو کی حضور میں حضرت قدر قدرت کے عرض کی۔ حضرت نے اسے نظم فرما کے ایک مثنوی[2] لکھی اور کئی لاکھ روپیہ صرف کر کے اس کا ایک رہس تیار کروایا۔ اس کے پہلے دن کے جلسے کا یہ بیان ہو کہ قیصر باغ میں جو فرحت منزل تھی، اس میں اس جلسے کی تیاری ہوئی۔ اور حضرت نے جتنے عزیز جلیل القدر اور شہزادے تھے، سب کو بُلا بھیجا اور وہ سب آ کر فرحت منزل میں کرسیوں پر بیٹھے اور

---

[1] تاریخ اقتداریہ صفحہ ۲۸۱

[2] مثنوی دریائے تعشق میں غزالہ اور ماہ رو کا قصّہ بیان کیا گیا ہو۔

حضرت قدر منزلت شہ نشین میں رونق افروز ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کوٹھی فرحت منزل میں یہ تیاری تھی کہ فرش سُرخ باناتِ سلطانی کا گسترده تھا اور چھت پر پردے بھی ویسے ہی تھے، اور جس شہ نشین پر حضرت قدرقدرت منزل گزیں تھے، وہاں مخمل کاشانی کے پردے بندھے تھے اور اُن پر بیل بوٹا اور ترنج سلمے ستارے کا بنا ہوا تھا۔ اور جھاڑ سوسو بتی کے آویزاں تھے، اور دیوارگیریاں پچیس پچیس بتی کی دیواروں میں چسپاں تھیں اور آئینے قدآدم تصویر و غیر تصویر کے لگے تھے جن کے فریم طلائی تھے اور سب جھاڑوں اور دیوارگیریوں میں کنول نیل پانی کے روشن[1] تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ پرستان کا مکان ہے[2]"

جلسے کا تفصیلی بیان اقتدار الدولہ کی زبانی نواب اقتدار الدولہ واجد علی شاہ کے پھپھا تھے اور رئیس کے جلسوں میں برابر شریک ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے ان جلسوں کا آنکھوں دیکھا حال تفصیل سے بیان کیا ہے[3]۔ یہاں وہ بیان دوسرے لفظوں میں کسی قدر اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے انگریزی باجے بجتے ہوئے اور روشن چوکی پھنکتی ہوئی آئی اس کے پیچھے کوئی ڈیڑھ سو حسین عورتیں رنگ برنگ کے بہت بھاری پُرزر جوڑے پہنے ہوئے آئیں بعض ہاتھوں میں گلدستے اور بعض منقش کی چھڑیاں لیے ہوئے تھیں۔ کوئی سوا سو طبلے، دو سو سے اوپر سارنگیے اور اتنے ہی تال جوڑی والے اُن کے ساتھ

---

[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جلسہ رات کے وقت ہوا تھا

[2] تاریخ اقتداریہ صد ۲۶۵

[3] یہ بیان بڑی تقطیع کے سترہ صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ دیکھیے تاریخ اقتداریہ صد ۲۶۵ - ۲۸۱

تھے۔ وہ سب عورتیں آکر مجمع کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔ ساز بجنے لگے اور جھومر کا ناچ ناچنے لگیں۔ ایک اِدھر سے گلدستہ ہاتھ میں لیے ہوئے ناچتی ہوئی چلی اور اُدھر سب کے بیچ سے نکل گئی اور ایک اسی طرح اُدھر سے آئی اور سب کی بغل سے نکل گئی۔ وہ سب ناچتی جاتی تھیں اور چھڑیوں کی مار کرتی اور گلدستوں کی بہار دکھاتی جاتی تھیں۔ اس وقت کا پرستانی سماں بیان سے باہر ہے۔ کوئی چار گھڑی جھومر کا ناچ ہوتا رہا۔ اُس کے بعد وہ سب عورتیں "حضرت کا آداب بجالا کر" ایک جگہ کھڑی ہوگئیں اور ایک ایک عورت ناچنے لگی۔

جب ناچ ختم ہوا تو ایک کارچوبی مسند لاکر بچھائی گئی اور ایک شخص بادشاہ بن کر اُس پر آکے بیٹھا اور سب عورتیں یہ بول گانے لگیں "جان عالم رہس مبارک جان عالم رہس مبارک" پھر اس بادشاہ کا وزیر اور امیر امرا حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ میرے یہاں اب تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ میرے بعد اس تخت و تاج کا مالک کون ہوگا! وزیر نے عرض کیا کہ غلام نجومیوں اور پنڈتوں کو بلواتا ہے، حضرت اُن سے دریافت فرمائیں۔ وزیر کے حکم سے ایک چوب دار گیا اور نجومیوں اور پنڈتوں کو لاکر حاضر کیا۔ بادشاہ کے دریافت کرنے پر انھوں نے "اپنے اپنے علم میں بچار کرکے" عرض کیا کہ کسی درویش کی دعا سے آپکے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوگی۔ وہ سب حسب مرتبہ خلعت پاکر رخصت ہوئے۔

اب وزیر بادشاہ کے حکم سے کسی صاحب کمال درویش کی تلاش میں نکل کر سرِ صحرا چلا۔ تو اس رہس میں ایک صحرا بھی بنا ہوا تھا اور اس میں ایک چبوترہ تھا نگ مرمر کا اس پر ایک بہروپیے سے ایک درویش بنوا کر بٹھایا تھا۔ اس چبوترے کا زینہ باڑھ دار تلوار کا تھا۔ وہ درویش اُس پر پاؤں رکھ کر چڑھتا اترتا تھا۔ وزیر یہ کیفیت دیکھ کر واپس آیا اور درویش کی کرامت بادشاہ سے بیان کی۔ بادشاہ وزیر کے ساتھ

درویش کے پاس گیا۔ وہ بڑی بے نیازی سے پیش آیا۔ اور بہت منت سماجت کے بعد ملاقات ہوئی۔ بادشاہ نے اُس کے قدموں پر سر رکھ دیا اور اپنا مطلب عرض کیا۔ اس نے کہا کہ وہ سامنے جو سیب کا درخت ہے اُس سے ایک پھل توڑ لاؤ۔ پھر کچھ پڑھ کر اس سیب پر دم کر کے بادشاہ کو دیا کہ آدھا تم کھانا اور آدھا ملکہ کو کھلانا۔ خدا کی عنایت سے تمھارے یہاں اولاد ہوگی۔ بادشاہ وہ سیب لے کر "درویش کا آداب بجا لاکر" اپنی جگہ پر واپس آیا۔ قریب ہی ایک مصنوعی محل تھا، وہ اُس میں داخل ہوا اور درویش کی ہدایت پر عمل کیا۔ جب "گویا دو مہینے اس بات کو گزر گئے" تو خواجہ سرا نے ملکہ کے حمل کی خوش خبری سنائی۔ بادشاہ نے شکر کا سجدہ کیا اور دو رکعت نماز ادا کی۔ بادشاہ کے حکم سے اس خوشی میں توپیں چھوٹیں اور وزیر اور خواجہ سرا کو خلعت عنایت ہوئے۔ حمل کے ساتویں مہینے ستوانسے کی رسم ادا کی گئی اور نو مہینے کے بعد غزالہ پیدا ہوئی۔ اس کے بعد یہ جلسہ برخاست ہو گیا۔

دوسرے دن پھر اسی طرح واجد علی شاہ شہ نشین پر اور سب عزیز اور شہزادے اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے "اسی طرح رہس مبارک آیا" اور اسی طرح پہلے عورتوں کا ناچ ہوا۔ اس کے بعد اسی طرح وہ بادشاہ آکر مسند پر بیٹھا اور سب وزیر و امیر حاضر ہوئے۔ وزیر نے بادشاہ سے عرض کیا کہ آج غزالہ کی چھٹی آ رہی ہے۔ بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ پھر چھٹی بڑی دھوم سے آئی۔ آگے آگے گھوڑوں پر نوبت بجتی ہوئی۔ اس کے بعد عملہ، چوب دار، برچھی والے، بھالے والے، بان دار، خاص بردار، کوئی ہزار نفر، اس کے بعد ایک طلائی پالنا، ایک کارچوبی ادقچے کی چھوٹی سی طلائی پلنگڑی، اور سوکشتیاں جن میں ہنسلی، کھڑوے، ہیکل، سب طلائی جواہر نگار اور مینا کار، جھبتی، جھنجھنے اور کھلونے سب طلائی جواہر نگار، بادشاہ اور زچہ کے واسطے خلعت اور غزالہ کے لیے بھاری بھاری کرتے اور ٹوپیاں تھیں۔ اتنا جلوس تھا کہ چھ گھڑی رات گئے چھٹی کی آمد شروع

ہوئی، اور دو پہر رات گئے وہ آکے پہونچی ۔ اُس کے بعد زچہ گود میں بچّہ لیے ہوئے تارے دیکھنے نکلی، اس طرح کہ بہت سی عورتیں ننگی تلواروں کا سایہ سر پر کیے ہوئے، ہاتھوں میں قرآن لیے ہوئے اور دائی ایک طلائی سینی میں چوک لیے ہوئے ۔ زچہ نے طلائی چوکی پر کھڑے ہو کر تارے دیکھے اور بادشاہ زچہ کے چھپر کھٹ پر ایک پیر رکھ کر کھڑا ہوا، ادھر زچہ تارے دیکھ کر پھری اور آکر چھپر کھٹ پر بیٹھی، اُدھر بادشاہ نے مرگ ماری ۔ ہزار روپے مرگ مارنے کے ملے ۔ اس کے بعد جلسہ برخاست ہوگیا ۔

رہس کے پہلے دن ارباب نشاط کی داروغہ حیدری طوائف نے زچہ کا پارٹ کیا تھا اور آج بھی وہی زچہ بنی تھی ۔ جو عورتیں تلواروں کا سایہ کیے ہوئے اور قرآن ہاتھوں میں لیے ہوئے زچہ کے ساتھ تھیں، وہ سب رہس والیاں تھیں ۔

پھر شام کو روشن الدولہ کی کوٹھی قیصر منزل میں جلسہ ہوا ۔ سب لوگ وہیں حاضر ہوئے ۔ رہس شروع ہوا ۔ ایک بادشاہ اپنے فرزند ماہ رو کے ساتھ آکر بیٹھے ۔ ناچ ہونے لگا ۔ اتنے میں پریوں کے تخت آئے اور وہ بھی آکر بیٹھیں ۔ بادشاہ اور ماہ رو ان پریوں کو دیکھ کر گھبرا گئے ۔ ان میں سے ایک پری بولی کہ ہم تمھارے دوست ہیں، دشمن نہیں ۔ اس وقت سیر کو جا رہی تھی ۔ ماہ رو کی وضع طرح مجھے بہت پسند آئی اور میں ان سے ملنے کے لیے اتر آئی ۔ میرا نام لال پری ہے اور میرے والد لال شاہ لاکھ دیووں اور پریوں کے سردار ہیں ۔ اب میں آیا کروں گی اور کبھی کبھی ماہ رو کو اپنے گھر لے جایا کروں گی ۔ بادشاہ نے یہ بات مان لی ۔ ناچ ہونے لگا ۔ کچھ دیر بعد لال پری چلی گئی ۔ اس طرح لال پری کئی مرتبہ آئی اور ایک دفعہ شہزادے ماہ رو کو اپنے ساتھ لے گئی ۔ اس کے بعد محفل برخاست ہوگئی ۔

آج کی صحبت میں رہس والیاں پریاں بنی تھیں ۔ ان کے پر سلمے ستارے کے کار چوبی تھے اور ان کی پوشاک ایسی پُر زر تھی کہ اُس پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی ۔

دوسرے دن شام کو جب شاہزادے معشوق منزل[1] میں جمع ہوئے۔ واجد علی شاہ بھی تشریف لائے۔ پہلے اسی طرح رہس کا ناچ ہوا۔ اس کے بعد وہ پہلا بادشاہ یعنی غزالہ کا باپ، اُس کا وزیر، اور سب امیر امرا حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ اب غزالہ سات برس کی ہو گئی ہو۔ کسی ہمارے ہم مرتبہ بادشاہ کا کوئی شہزادہ ہو تو اس کے ساتھ غزالہ کی نسبت کی جائے۔ وزیر تلاش میں نکلا اور کامیاب واپس ہوا۔ نسبت طے ہو گئی۔ غزالہ مانجھے بیٹھی اور دولہا کے لیے مانجھے کا جوڑا بڑی دھوم سے باجے اور نشان کے ساتھ گیا۔ مانجھے کی دھوم دھام اور ناچ رنگ میں رات گزر گئی۔

اس کے بعد ایک رات ساچق کے جلسے میں اور دوسری رات مہندی کے جلسے میں گزر گئی۔ تیسری رات کو بڑی دھوم سے بارات آئی۔ روشنی کی کوئی انتہا نہ تھی ہزار ہا جھاڑ اور پنج شاخے روشن تھے اور برات کا کل سامان ساتھ تھا۔ دولہا آکر مسند پر بیٹھا اور ناچ ہونے لگا۔ پھر عقد ہوا اور اس کے بعد شربت پلایا گیا۔ واجد علی شاہ اور سب شاہزادوں نے شربت پیا اور شربت پلائی دی۔ اقتدار الدولہ نے بھی شربت پیا اور ایک اشرفی شربت پلائی دی۔ اتفاق سے اسی وقت لال پری اپنے تخت پر سیر کے لیے جا رہی تھی۔ ماہ رو بھی اس کے ساتھ تھا۔ شادی کا سامان دیکھ کر اُس نے اپنا تخت ٹھہرایا اور شادی کی بہار دیکھنے لگی۔ شہزادہ ماہ رو کی نگاہ جو غزالہ پر پڑی تو وہ اس پر عاشق ہو کر غش کھا کے گر پڑا۔ یہ دیکھ کر لال پری غصے میں آکر غزالہ اور اس کے دولہا کو اٹھا لے گئی اور ایک جنگل میں پھینک دیا۔ دولہا دلھن کے یکایک غائب ہو جانے پر محفل میں رونا پیٹنا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور جلسہ برخاست ہو گیا۔

---

[1] بقول اقتدار الدولہ قیصر باغ کی نہر کے ایک طرف راحت منزل تھی اور دوسری طرف معشوق منزل تھی

دوسرے دن قیصر باغ میں سلطانی بانات کا کوئی سو چوب کا بہت بڑا گیرہ تنا گیا۔ لال پری غصے میں بھری اپنے مکان میں آکر بیٹھی۔ اس کے مکان کے ایک کنویں میں شاہزادہ ماہرو قید تھا اور ہائے غزالہ وائے غزالہ" کے نعرے مار رہا تھا۔ کنویں پر دیوؤں کا پہرہ تھا۔ لال پری کی انیسیں اور جلیسیں اس سمجھا رہی تھیں کہ آپ غصہ نہ کریں۔ ماہ رو کی یہ حالت کب تک رہے گی۔ مایوس ہو کر آپ کی طرف مائل ہوگا۔ لال پری کے کہنے سے وہ سب پری زادیں اس کی بڑی بہن کو بلانے گئیں۔ وہ بڑے تجمل سے آئی۔ لال پری نے اٹھ کر سلام کیا اور اس نے چھوٹی بہن کو گلے لگایا اور اس کی طرف دیکھ کر پوچھا کہ خیر تو ہے، تمھارا چہرہ اداس کیوں ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ ان دنوں مجھے خفقان کی شدت ہو۔ آپ کو اسی لیے تکلیف دی ہو کہ آپ کے آنے سے کچھ جی بہلے گا۔ اتنے میں کنویں سے ماہ رو کی آواز آئی کہ "ہائے غزالہ جان تم کہاں ہو۔ اپنے عاشق کی خبر کیوں نہیں لیتی ہو؟"۔ سبز پری نے جو یہ آواز سُنی حیران ہو کر پوچھا کہ یہ آدم زاد کی آواز کہاں سے آئی؟ لال پری نے سارا حال کہہ سُنایا۔ سبز پری کے کہنے سے ماہ رو کو کنویں سے نکال کر اُس کے سامنے لایا گیا۔ سبز پری نے اس کو سمجھایا اور کہا کہ غزالہ اب کہاں۔ میری بہن نے اس کو جنگل میں پھینک دیا تھا کسی درندے نے اُسے کھا لیا ہوگا۔ ماہ رو نے کچھ جواب نہ دیا، رونا شروع کیا۔ لال پری نے اس کو پھر کنویں میں قید کردیا۔ سبز پری رخصت ہو کر اپنے گھر گئی۔ اتنے میں صبح ہوگئی۔ اور جلسہ برخاست ہوگیا۔

لال پری کا مکان ابرق کا بنا ہوا تھا۔ آدمیوں کے منھ پر منقوے کے چہرے چڑھا کر دیو بنائے گئے تھے۔

دوسرے دن شاہی چوب دار سے واجد علی شاہ کا حکم سُن کر سب شاہزادے صبح[1] ہی قیصر منزل میں حاضر ہوئے۔ حضرت دنگل پر رونق افروز ہوئے اور سب

---

[1] سنسکرت کے مختلف قسم کے ڈراموں کو کھیلنے کے لیے صبح، سہ پہر، رات کا پہلا دور جو تھا پہر مقرر تھا۔

شاہزادے فرش پر دوزانو بیٹھے۔ سامنے سے ایک نوجوان گیرو ے رنگ کی کفنی پہنے ہوئے آیا اور ایک جگہ ٹھہر گیا۔ اسی وقت نیلم پری سیر کے لیے نکلی تھی اس کی نظر جو اس نوجوان پر پڑی تو وہ اس پر عاشق ہو گئی اور اس کے پاس آکر حال پوچھا۔ اس نے بتایا کہ میں شہزادہ ماہ رو کا وزیرزادہ ہوں، لال شاہ کی بیٹی لال پری اُس پر عاشق ہو کر اپنے ساتھ لے گئی۔ دو مہینے سے اس کا پتہ نہیں۔ معلوم نہیں کہ اس کو مار ڈالا ہو یا قید کر دیا ہو۔ میں اس کے غم میں فقیر ہو کر اس کی تلاش میں نکلا ہوں۔ نیلم پری نے اُس کو اپنے ساتھ لیا اور پرستان میں لے جاکر اُتارا۔ یہ پُرانے دولت خانہ میں تھا۔ باقی جلسہ وہیں ہوا۔ چار گھڑی دن رہے جلسہ برخاست ہوا۔

دوسرے روز شام کو پھر سب لوگ حاضر ہوئے۔ اسی طرح رہس شروع ہوا۔ نیلم پری نے وزیرزادے کی بڑی پُرتکلف دعوت کی اور اپنے بھائی استبرق شاہ کو بلاکر وزیرزادے سے ملاقات کروائی۔ اُس نے وزیرزادے سے سب حال سن کر اُس کو تسلی دی اور کہا کہ میں پہلے غزالہ کو ڈھونڈلاؤں، پھر ماہ رو کو قید سے چھڑاؤں۔ قصہ مختصر، استبرق شاہ غزالہ کو ڈھونڈ لایا اور نیلم پری کو سپرد کرکے ماہ رو کی تلاش میں نکلا اور لال پری کے یہاں پہونچ کر اس کو بھی کنوئیں سے نکال لایا۔ دوسرے دن لال پری کو خبر ہوئی تو اُس نے اپنے باپ لال شاہ کو بلاکر سارا قصہ کہہ سنایا۔ اس نے اسی وقت استبرق شاہ کو خط لکھا کہ تم میرے ملک میں آکر میری بیٹی کے قیدی کو نکال لے گئے۔ اس خط کو دیکھتے ہی ماہ رو کو بھیج دو ورنہ ہمارے تمھارے بگڑ جائے گی۔ استبرق شاہ نے اُس کے خط کے جواب میں لکھا کہ تمھاری بیٹی نے ایک

(سلسلۂ گزشتہ) آدھی رات، دن کی دوپہر اور کھانے کے وقتوں میں ڈراما کھیلنا منع تھا، لیکن راجا کے حکم سے ہر وقت کھیلا جا سکتا تھا (انڈین تھیٹر، مصنفہ چندر بھان گپت۔)

آدم زاد پر عاشق ہو کر اُسے اپنے گھر میں رکھا اور پھر قید کر دیا۔ تمھاری غیرت کو کیا ہوا کہ اپنی بیٹی کو کچھ سزا نہ دی اور اُلٹے مجھے لکھا کہ اس کو بھیج دو۔ اب کبھی ایسا خط مجھ کو نہ لکھنا۔ یہ جواب پا کر لال شاہ نے جنگ کی تیاری شروع کر دی اور ادھر استبرق شاہ اپنی فوج کی درستی میں مصروف ہوا۔ اتنے میں صبح ہو گئی اور جلسہ برخاست ہو گیا۔

مؤلف اس جلسے کا حال کہاں تک بیان کرے۔ اس جلسے میں لاکھ روپے سے کم خرچ نہیں ہوا۔

دوسرے دن سب لوگ شاہ منزل کے میدان میں جمع ہوئے۔ واجد علی شاہ زرہ، بکتر، چار آئینہ، خود اور دستانے پہن کر، سب ہتھیار لگا کر تخت شاہی پر بیٹھے۔ شاہی فوج میدان میں پرا جما کر کھڑی ہوئی۔ ایک طرف سے لال شاہ اپنی فوج کے ساتھ ہاتھی پر سوار آیا۔ دوسری طرف سے استبرق شاہ آیا۔ لڑائی شروع ہوئی اور تلوار چلنے لگی۔ آخر لال شاہ کی فوج کے پاؤں اُٹھ گئے اور وہ بھاگ کر قلعہ بند ہو گیا۔ استبرق شاہ نے قلعے پر دھاوا کر دیا اور قلعے پر سے بھی مار پڑنے لگی۔ آخر استبرق شاہ فتح یاب ہوا اور قلعے میں جا کر لال شاہ کا سر قلم کر دیا۔ اس کے لشکر میں شادیانے بجنے لگے۔ لال پری باپ کا سر اپنے سامنے رکھ کر روتی رہی اور اُس سر کو لیے ہوئے اپنے مکان کی طرف چلی گئی۔ کوئی دو گھڑی دن رہے جلسہ ختم ہوا۔

قلعہ کاغذ کا ایسا بنایا تھا کہ بالکل اصلی معلوم ہوتا تھا۔ فصیلوں پر توپیں چڑھی ہوئی تھیں گولہ انداز مستعد کھڑے تھے اور تیر انداز تیر و کمان سے لیس تھے۔ کچھ ایسی تدبیر کی گئی تھی کہ لڑائی میں جب کسی پر تلوار پڑتی تھی تو خون نکلتا تھا۔ قلعے کی جنگ بالکل سچ مچ کی لڑائی معلوم ہوتی تھی۔

دوسرے دن شام کو پھر سب لوگ حاضر ہوئے۔ اسی طرح رہس شروع ہوا۔

ایک طرف استبرق شاہ کے یہاں محفل آراستہ تھی۔ ماہ رو اور غزالہ، وزیرزادہ اور نیلم پری
یہ سب موجود تھے۔ ذکر یہ ہو رہا تھا کہ ماہ رو کی شادی غزالہ کے ساتھ ہو جائے۔ دوسری
طرف لال پری نے اپنا حال تباہ کیا تھا۔ اس کی بہن سبز پری نے آکر جو اس کا یہ حال
دیکھا تو استبرق شاہ کی محفل میں پہونچ کر ایک ایسا منتر پڑھ کر دم کیا کہ ساری محفل
بیہوش ہو گئی اور وہ ماہ رو کو اٹھا لائی۔ گھڑی بھر کے بعد جب سب کو ہوش آیا
ماہ رو کو نہ پایا تو کہرام مچ گیا۔ اتنے میں رات گذر گئی اور جلسہ برخاست ہو گیا۔

دوسرے دن شام کو پھر سب لوگ حاضر ہوئے اور پھر رسم مبارک شروع ہوا
آج پھر وہی جلسہ آ موجود ہوا۔ لال پری نے ماہ رو سے کہا کہ میرا باپ بھی مارا گیا مگر میں
نے تیرے عشق سے ہاتھ نہ اٹھایا اور اپنا یہ حال کیا۔ اب تو غزالہ کا دھیان چھوڑ اور
اس کی محبت سے باز آ۔ ماہ رو نے کچھ جواب نہ دیا تب لال پری نے استبرق شاہ کو پ
بھیجا کہ آپ نیلم پری، ملکہ غزالہ اور وزیرزادے کے ساتھ میرے یہاں تشریف لا
مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے اور شہزادہ ماہ رو میرے پاس ہے اس کو آکر لے جائیے۔ است
شاہ تینوں کو ہمراہ لے کر فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ جب لال پری کے مکان کے قریب
پہونچا تو اس نے باہر آکر استقبال کیا اور چاروں مہمانوں کو اندر لے گئی۔ استبرق
اور نیلم پری کو ایک مسند پر بٹھایا اور سب سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں ماہ رو پر ہزار جان
عاشق ہوں۔ میرا باپ مارا گیا، سب لشکر کٹ گیا، پھر بھی میں نے اس کی محبت
ہاتھ نہ اٹھایا۔ مگر اس نے کبھی میری پرواہ نہ کی۔ آج میں زہر کا پیالہ پی کر خود کو
کرتی ہوں۔ تم سب گواہ رہنا کہ میں نے اس کے عشق میں جان دی یہ کہہ کر پیالہ اٹھا
پینے ہی کو تھی کہ غزالہ نے پیالہ چھین لیا اور کہا کہ میں خوشی سے ماہ رو کو تمھارے سا
رہنے کی اجازت دیتی ہوں۔ لال پری نے غزالہ کی بلائیں لیں اور کہا کہ یہ تمھاری
ہے۔ مگر پیالہ مجھے دو کہ میں پی لوں۔ اس وقت استبرق شاہ اور نیلم پری نے یہ ف

کیا کہ ماہ رو ایک رات غزالہ کے یہاں رہے اور ایک رات لال پری کے یہاں۔ اس فیصلے سے سب خوش ہوئے اور شادی کی تجویز ٹھہری۔

دو دن کے بعد سب لوگ قیصر منزل میں جمع ہوئے۔ ماہ رو کے والدین بڑی دھوم سے بیٹے کی برات لائے۔ پہلے اس کا عقد غزالہ کے ساتھ ہوا۔ پھر لال پری کے ساتھ اس کے بعد نیلم پری کا عقد وزیر زادے کے ساتھ ہوا۔ اور یہ جلسہ تمام ہوا۔

رہس کے جلسے کا تفصیلی حال بیان کرنے کے بعد اقتدار الدولہ لکھتے ہیں کہ "ایک مہینہ دس روز یہ سب سامان رہا۔[1]" لیکن انھوں نے صرف چودہ صحبتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحبتیں روز نہیں ہوتی تھیں، بلکہ ان کے درمیان میں کچھ کچھ وقفہ بھی ہو جایا کرتا تھا۔ آخری صحبت خود ان کے بیان کے مطابق پچھلی صحبت کے دو دن بعد ہوئی تھی۔

جلسے کا اجمالی بیان سرور کی زبانی

رہس کے اس نئے جلسے کے متعلق رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں۔

"رہس مبارک بے مشورۂ غیر ایجاد ہو چکا ہے۔ صدہا ملازم نو کو فیض تعلیم سے اس کا کام یاد ہو چکا ہے۔ بڑے بڑے، دھوم دھام کے، اژدہام کے، جلسے رہے۔ صبح شام کے جلسے رہے۔ ناچ نرالے، تال سم سے ہر سمت ناز کا ہے۔ جو ساز و سامان ہے نرالا ہے۔ لاکھوں روپیہ خرچ ہو گیا۔ جو جیب سے ہے نادر ہے، اعلیٰ ہے۔ متفق اللفظ سب کا یہ کلام ہے، اس سے بہتر اللہ کا نام ہے۔[2]"

(اس سلسلے میں دیکھیے اسی کتاب کا صفحہ ۲۱۰۔)

۱۔ تاریخ اقتداریہ ص ۲۸۱   ۲۔ فسانۂ عبرت ص ۱۰۳

ڈرامہ غزالہ ماہ رو

بمبئی کے پارسیوں نے جب ناٹک کمپنیاں قائم کرکے اردو ڈراموں کے لیے ایک نئی طرح کا اسٹیج تیار کیا اور اس اسٹیج کے لیے نئی طرح کے ڈرامے لکھے جانے لگے تو واجد علی شاہ کی مثنوی دریائے تعشق سے بھی بہت کچھ ردو بدل، حذف و اضافہ کرکے چند ڈرامے تیار کیے گئے۔ ایسے دو ڈرامے میرے علم میں ہیں۔ ایک کا نام ہے نیرنگ قاف معروف بہ غزالہ ماہ رو، جس کو اس زمانے کے مشہور ڈراما نگار منشی محمد الف خاں حباب رام پوری نے تالیف کیا اور چند سال بعد ۱۹۰۰ء میں محمد وزیر، مالک مطبع گلزار محمدی، لکھنؤ، نے شائع کیا۔ اس کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر نوروزجی کی اوریجنل وکٹوریہ ناٹک کمپنی، بمبئی نے یہ کھیل اس خوبی سے دکھایا کہ دیکھنے والوں کو برسوں یاد رہا۔ اس کا آخری سین، جس میں لال پری کا خنجر مارنا اور زہر پینا دکھایا گیا تھا، بہت پر اثر تھا۔ اس ڈرامے کا ایک مطبوعہ نسخہ راقم کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کے سرورق پر لکھا ہوا ہے "ماخوذ از مثنوی دریائے تعشق سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ سابق بادشاہ اودھ فردوس منزل۔"

دریائے تعشق پر مبنی دوسرا ڈراما اس وقت کے ایک ایکٹر سید نظیر حسن شفیق اکبر آبادی عرف چھوٹے میاں نے ترتیب دے کر جون ۱۸۹۲ء میں شائع کیا۔ یہ ڈراما میری نظر سے نہیں گزرا، لیکن مذکورہ بالا ڈرامے کے سرورق کی پشت پر جو فہرست کتب "تماشہ ہائے ناٹک" درج ہے، اس میں اس کا لمبا سا بے ڈھنگا نام اس طرح لکھا ہوا ہے۔ "غزالہ ماہ رو سلیس و خلیق معروف بہ حیرت افزا ناٹک شفیق۔"

عہد شاہی میں رہس کا دوسرا جلسہ

مثنوی افسانۂ عشق کا ڈراما: سیم تن اور ماہ پیکر کا قصہ

| یہ جلسہ کب تیار ہوا | واجد علی شاہ کے عہد سلطنت میں شاہی رہس کا پہلا جلسہ جو ۱۲۶۷ھ میں تیار ہوا تھا اس کا بہت مختصر طور پر ذکر کرنے کے بعد رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں:

"دفعتاً اور مرد و زن کا نصیب یاد ہوا۔ دوسرا جلسہ تیار ہوا۔ وہ اس سے بہتر ہوا، عجب چاشنی کا قند مکرر ہوا۔ خیال کیجئے، مقام غور کا ہو، یہ کام کسی اور کا ہو؛ کس قدر جلد یہ کارخانہ درست ہوا۔ ایسی بات کسی کے کان میں آئی ہی ہتھیلی پر سرسوں جمائی ہے۔"[۱]

سرور کا یہ بیان، خاص کر اس کا پہلا لفظ اور آخری جملہ، بتاتا ہو کہ رہس کا پہلا جلسہ تیار ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد اسی سال کے اندر دوسرا جلسہ تیار ہو گیا۔ صغیر نے ان دونوں جلسوں کا ذکر ایک ساتھ کیا ہو۔ کہتے ہیں:

"رہس دونوں تیار شہ نے کیے جو قصے سماعی تھے، دکھلا دیے"[۲]

اس سے سرور کے بیان کی تصدیق ہوتی ہو۔

---

[۱] فسانۂ عبرت ص ۱۰۳

[۲] آئین اختر ص ۴۵

سرؔور کے قلم سے | شاہی رہس کے اس دوسرے جلسے کے متعلق سرؔور لکھتے ہیں۔ جلسے کا تفصیلی بیان

"حضرت نے ایک مثنوی تنظم فرمائی ہو۔ اس نقل کی اصل کر کے سب کو دکھائی ہو۔ . . . . . . ایسا دل فریب گانا ادہ ناسپنے کا انداز جداگانہ۔ وہ جو مشہور ناچ ہیں، ڈھنگ دس پانچ ہیں۔ ان سے جدا یہ ایجاد ہیں، جو اُن کو یاد ہیں۔ نام ایسے خوب صورت کہ ان سے مزہ ملتا ہو۔ کہہ نہیں سکتا کہ لطف کیا ملتا ہو۔ جس وقت وہ پرا، بالباس پُر زر یعنی جوڑے رنگین، بزت گو کھرو، مچکا لگا، چٹکی کی لوز مسالے کی کرتی انگیا، پاجامے سوسو گز اطلس کے مغرق بہت بھاری۔ سب نئی تیاری۔ یہ مجمع جھک کر سامنے آیا اور "چہ کچی رہو جان عالم" کا غل آسمان پر پہونچایا۔ طلسم کا سامان ہوگیا۔ جس نے دیکھا حیران ہوگیا . . . . ایک کا نام رہس بنّا ہو . . . . . . دس بارہ رنڈیاں جمع کر کے ناؤ کا نقشہ بنایا وہ ناچنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ پری زاد ڈونگی چھم چھم کرتی چلی . . . . . . اس کے بعد دوسرا پرا آیا۔ نام جُدا، کام جدا۔

"جب یہ جلسہ تمام ہوا، ناچ گانے کا انتظام ہوا، تو باغ و صحرا[1] کی باری آئی۔ گلشن میں ملکۂ سیم تن کی سواری آئی . . . . ماہ پیکر کے غم میں خستہ جگر . . . . لب پر آہ دنالے۔ دفعتہً ماہ پیکر کا گھوڑا شیر کھا گیا۔ پیادہ پائی کا رنج سر پر سوار ہوا . . . درختوں سے اس کا سر ٹکرانا، ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کے رونا، بلبلانا۔ کبھی جو شعر دردناک لب پہ آیا تو

---

[1] باغ و صحرا سے یہاں وہ مصنوعی باغ اور جنگل مراد ہو جو رہس کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ آئندہ صفحوں میں اس کی تفصیلی کیفیت بیان کی جائے۔ ادیب

سیلنہ فلک بے مہر گار کیا۔۔۔۔۔ سلیمان زماں کے بیان سے تو ما سا بے مروت آنکھ نہیں پھیرتا، راہ پر بن جاتا ہے۔ رحم کھا کے داؤد جن کو ڈھونڈ لاتا ہے اس کی سواری کا تخت عجب ڈھنگ کا ہے۔۔۔ پوشش پر اس کی ابر کا گمان ہوتا ہے۔ مختلف نے گرد دھواں ہوتا ہے۔ اسی دھواں دھار تخت پر سوار آتا ہے۔۔۔ ٹپ اس کا جب کھلتا ہے۔۔۔ جن اپنی صورت دکھاتا ہے، ماہ پیکر کی غم خواری، دل داری کرتا ہے۔۔۔ طاؤس بن کے سیم تن کے باغ میں جاتا ہے۔۔۔ پھر دل کو بہلاتا ہے۔"

"ادھر اس نے بچھڑوں کو باہم کیا، اُدھر فلک۔۔۔ نے۔۔۔ جلسہ برہم کیا۔ پھر وہاں عاشق خداداد دلیش۔۔۔ حسب طلب آ نکلے۔ سیم تن کے ماں باپ کے مطلب بر آئے۔۔۔ بڑی کوشش اور کد سے داؤد جن تو گرفتار ہوتا ہے، لیکن خوشی کے عوض سیم تن کا کنبہ ماتم دار ہوتا ہے۔۔ جن تو قید ہوا۔ مگر وہ پری پیکر محل سے غائب ہو گئی۔ دفعۃً کہرام ہوا۔۔۔ محل والے۔۔۔ اس مہ پارہ کے ہجر میں۔۔۔ بے قرار ہوئے ــــ زیادہ جس کو شوق ہو، مثنوی میں دیکھ لے۔[1]

جلسے کا اجمالی بیان نامی کے قلم سے

عظمت علی نامی لکھتے ہیں:

"۱۲۶۸ھ میں مزاج حضرت کا مصروف تماشائے رہس ایجادی طبعی ہوا اور دل لگی، سہو محو ہونے کا سامان بندھا۔ خود بدولت نے۔۔۔ ایک مثنوی چونچلوں بھری کہی اور اس میں حکایت طلع زاد غزالہ و سیم تن اور

۱ه فرّ: شعر صـ ۱۰۶

خورشید شاہ و ماہ پیکر کی منظوم کی۔ پھر اس نقل کو اصل کیا کہ سارا جلسہ، لوازمے اس کے، حقیقت دیو و پری، فقیر و جوگی، وزیر و بادشاہ، اکھرا اور انیڈوالا باغ اور پہاڑ، زچہ خانے اور چھٹی وغیرہ کا ہو بہو ویسا ہی بنوایا۔ لاکھوں کی تیاری ہوئی۔ پریوں کی پوشاک زریں کارچوبی بہت کچھ لگ کر بنی۔ عمدہ زیور بنا۔ اور سارا عملہ اس کا جزو و کل ذکر رکھا گیا۔ اس کے دو رہس قرار پائے...... بڑا رہس حیدری رنڈی، چکلے والی کو دیا اور چھوٹا رہس مستقیم الدولہ الہیا خاں کو ملا۔[1]

نامی کے اس بیان سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ واجد علی شاہ نے ایک ہی مثنوی میں غزالہ اور سیم تن کا قصہ نظم کیا اور اسی ایک قصے کے دو رہس قرار دیے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ غزالہ اور سیم تن کے قصے دو مختلف مثنویوں میں بیان کیے گئے ہیں اور ان کے دو مختلف رہس تیار کیے گئے تھے۔

قصے کا خلاصہ نامی نے اوپر جس مثنوی کے رہس کا ذکر کیا ہے اس کا قصہ بھی لکھ دیا ہے، جو غیر ضروری فقرے حذف کر دینے کے بعد حسب ذیل ہے۔

"بدرالدجی نام بادشاہ ایک ملک کا تھا۔ اس کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ بارے ایک فقیر کی دعا سے...... اس کا چاند سا بیٹا ہوا...... نجومی رمالوں کی تجویز سے ماہ پیکر اس کا نام رکھا گیا اور چودہ برس کی عمر میں اس کا صحرانورد ہونا لکھا تھا۔ اس لیے حفظ داشت کا مرتبہ حد کو پہنچا۔ بایں ہمہ جوں ہی چودھویں سال گرہ لگی شاہزادے کو خواہ مخواہ شوقِ شکار کی سوجھی۔ وزرا کو لے کر صید افگن ہوا...... ایک طلسمی ہرن کے پیچھے گھوڑا ڈالا۔ وہ

۱؎ مرقع خسروی، قلمی ورق ۲۰۳ ب ۲۰۴ الف

ایک حوض پر جاکر گم ہوگیا تو ساتھ ہی یہ بھی ... کود پڑا ..... ڈوبتے اچھلتے
ایک میدان میں جا نکلا۔ وہاں اِدھر اُدھر بھٹکا کیا۔

"پھر رفتہ رفتہ ایک پہاڑ پر پہنچا۔ دیکھتا کیا ہو کہ ایک جوان حسین
اس کی کھوہ میں پڑا ...... آہ آہ کر رہا ہے۔ تب اُس نے مشفقانہ استفسارِ
حال کیا اس نے ...... ایک تصویر دکھا کر حال کہا کہ میں ایک ملک
وسیع کا شاہزادہ ہوں اور اس ظالم کے ادائے شرائط میں مصروف ہو کر
اس حال کو پہونچا ہوں۔ نام اس کا ملکہ سیم تن ہو ...... شاہزادہ
ماہ پیکر بھی وہ تصویر ...... دیکھ کر لوٹ گیا اور ...... اُس پری کا
سودا ...... اُس کے سر چڑھا ...... ایک سمت کو بادیہ پیما ہوا۔ جب چلتے
چلتے تھکا تو نیچے ایک درخت کے ٹھہر کر سو گیا۔ وہاں گھوڑا اس کا شیر کھا
گیا۔ اب یہ تنہا پیادہ پا رہ گیا۔

"اتنے میں اُس درخت پر ایک جوڑا توتے کا آ بیٹھا ......
مادہ نے نر سے اس سوتے ہوئے بیچارے مصیبت کے مارے شہزادے کو پوچھا
...... نر نے کہا کہ ...... یہ شہزادہ ہو، سیم تن نام ایک شاہزادی پر
دل دادہ ...... اس پری پیکر تک پہونچا اور اُس کے شرائط کا پورا کرنا
بشر کے امکان میں نہیں ہو ...... پھر مادہ نے کہا للّٰہ تو اس کی مدد
کر ...... وہ بولا اچھا تیری خاطر ہے۔ ایک جن کا بیٹا میرا آشنا یار ہو ...
اب میں اس سے کہوں گا۔ کیا عجب ہو کہ اُس کے ذریعہ سے اس کا وہاں
تک پہونچنا ہو۔

"الغرض یہاں کی کیفیت تو یہ تھی، اُدھر سیم تن بھی اس شہزادے کو
خواب میں دیکھ کر عاشق بنی۔ بے چین رہنے لگی۔ آخر ...... توطے کی

مشقت سے جن ملاقات کو شہزادے کی آیا اور اُسے اپنے بازو پر بٹھا باغ میں سیم تن کے لے گیا۔ پس شہزادے نے جو ہیں سیم تن کو دیکھا بیہوش ہو کر گرا اور اُدھر سیم تن کو اپنی طرف غش آیا۔ اتنے میں اوپر سے ایک دیو اڑا ہوا جاتا تھا، سیم تن کو اس حالت میں دیکھ کر اٹھا لے گیا .... ناچار یہ خستہ خراب پھر آوارۂ دشت بلا ہوا ..... چلتے چلتے ایک شہرستان طلسم میں پھنس کر پتھر کا ہو گیا۔ تب وہاں ایک پری سرو سہی نے پڑھ کر مارا، اچھا کیا۔ اب آپ عاشق ہو کے اور اپنے ساتھ عقد کا وعدہ لے کے اپنے باپ شاہِ جن کے پاس لے گئی ...... اب اس کی معاونت سے دیو کے ساتھ لڑائی ہوئی اور صورت فتح کی نکلی۔ تب اُس نے پہلے سرو سہی کے ساتھ عقد کیا، بعد سیم تن کے گلے لگا۔ پھر سیم تن کو لے کر اس کے ملک میں آیا تب سیم تن کے باپ نے دھوم سے بیاہ کر دیا۔ اس وقت خیریت سے گھر آئے اور ماں باپ سے ملے۔[1]

سردار اور نامی نے رہس کے قصے کا جو خلاصہ لکھا ہو۔ اُس سے صاف ظاہر ہو کہ واجد علی شاہ کے عہد سلطنت میں شاہی رہس کا دوسرا جلسہ اُن کی مثنوی افسانۂ عشق سے تیار کیا گیا تھا۔

جلسے کا مختصر بیان صغیر کے قلم سے

صغیر لکھنوی واجد علی شاہ کی ایک مثنوی کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:۔

"پسند آئی وہ مثنوی اس قدر
کہ پڑھنے لگے لوگ شام و سحر

مگر شاہ نے یہ تکلف کیا
بنایا رہس بھی اسی حال کا

کیا تھا جو کچھ مثنوی میں بیاں
دکھا دی وہ سج کر کے سب داستاں

---

[1] مرقع خسروی، ورق ۲۰۴ ا۔ ۲۰۵ ب

ملازم ہوئے طفل و پیر و جواں — ملازم ہوئیں سیکڑوں لولیاں
ہر اک گل رخ و گل بدن ان میں تھی — خطابی مگر سیم تن ان میں تھی
کوئی ان میں طاؤس جادو بنا — کوئی آدمی شکل آہو بنا
کئی شاہزادے کئی دیو تھے — نہ تھے دیو، وہ رستم و گیو تھے
کئی عورتوں کے پری تھے خطاب — پئے امرداں مشتری تھے خطاب[1]
کوئی سرو قامت تھی سرو سہی — کوئی ان میں تھا تاجدار ہی
کسی کا تو بدر الدجیٰ نام تھا — کوئی ماہ پیکر دل آرام تھا[2]"

صغیر کا یہ بیان بھی بتاتا ہے کہ جس رہس کا ذکر ہو رہا ہے وہ واجد علی شاہ کی مثنوی افسانۂ عشق سے ترتیب دیا گیا تھا۔ سیم تن، طاؤس جادو، مشتری، سرو سہی، بدر الدجیٰ، ماہ پیکر یہ سب اسی مثنوی کے افراد ہیں۔

جلسے کا ذکر امانت کی زبان سے

امانت لکھنوی نے شرح اندر سبھا میں شاہی رہس کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں لکھا ہے ۔

"سرخ دوپٹا بھاری محفل میں تنتا ہے۔ شفق کا جواب بنتا ہوا، جس میں سے نور چھنتا ہے۔ زہرہ خصال مشتری جمال کس پھرتی سے ناچ ناچ کر اُس کے تلے سے نکل جاتے ہیں! ...... مثنوی حضرت کی پڑھی جاتی ہے، میر حسن کی روح تازگی پاتی ہے[3]"

یہاں مثنوی سے امانت کی مراد بھی مثنوی افسانۂ عشق ہے۔ اس لیے کہ واجد علی شاہ کی

۱؎ اس شعر سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ جس طرح رہس میں کام کرنے والی عورتیں پریاں کہلاتی تھیں اسی طرح لڑکے مشتری کہلاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مثنوی افسانۂ عشق میں مشتری ایک بادشاہ کا نام ہے، جس کا پایۂ تخت شہر تاباں تھا۔ (ادیب) ۲؎ مثنوی آئین اختر ص ۱۴۴-۱۴۵ ۳؎ اندر سبھا مع شرح ص ۶

افسانوی مثنویوں میں صرف یہی ایک مثنوی ہو جو مثنوی میر حسن کی بحر میں ہو۔ بلکہ اس کے جواب میں کہی گئی ہو۔ واجد علی شاہ کے ایک مصاحب نے یہ مثنوی کہنے کی درخواست یوں کی تھی :۔

"اک ارشاد ہو مثنوی جاں فزا رہے نام نامی کا جس سے پتا
ہر اک مثنوی حسن بھول جائے مزہ کچھ نہ اس کے حضور اس میں آئے"

ناامی کے قول کے مطابق مثنوی افسانۂ عشق کا جلسہ ۱۲۶۸ھ میں تیار ہوا[۱] مگر بعض قرینوں کی بنا پر اوپر لکھا جا چکا ہو کہ یہ جلسہ ۱۲۶۶ھ | تماشائیوں کے حلقے میں توسیع

میں تیار ہو چکا تھا۔[۲] اسی سال شعبان کے مہینے میں بادشاہ کی دوسری شادی اپنے وزیر کی صاحب زادی سے اور[۳] ذی الحجہ کے مہینے میں دو شاہزادوں[۴] کی شادیاں بڑی دھوم سے ہوئیں[۵]۔ قیاس کہتا ہو کہ ان شاہانہ تقریبوں میں ناچ رنگ کی محفلوں کے ساتھ رہس کا یہ نیا جلسہ بھی ہوا اور معززین شہر کو جو ان تقریبوں میں شریک تھے، پہلے پہل شاہی رہس کا جلسہ دیکھنے کا موقع ملا۔ اس سے پہلے جو رہس کا جلسہ تیار ہوا تھا اس میں اقتدار الدولہ کے بیان کے مطابق صرف خاندان شاہی کے وہ افراد اور شاہ زادے شرکت کرتے تھے جن کو بادشاہ خاص طور پر بلواتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ہم عصر مصنفوں میں سرور، نامی، صفیر، امانت دوسرے جلسے کے تفصیلات سے واقف تھے، لیکن پہلے جلسہ سے یا تو بالکل ناواقف تھے یا بہت اجمالی واقفیت رکھتے تھے، تفصیلات کا مطلق علم نہ تھا۔ اس کا تفصیلی حال صرف نواب اقتدار الدولہ نے لکھا ہو جو خاندان شاہی کے ایک رکن تھے اور اس جلسے کی ہر صحبت میں شریک تھے۔[۶]

۱؎ افسانۂ عشق ص۱۰۱ ۲؎ صفحہ ۱۴۲ ما قبل ۳؎ ۱۴۰ ما قبل ۴؎ قیصر التواریخ جلد دوم ص۸۸

۵؎ صاحب عالم ولی عہد کیوان قدر میرزا اور صاحب عالم جنرل فریدون قدر مرزا محمد نوبر علی۔

۶؎ عشق نامۂ منظوم ص۶۸۱-۶۸۶ و فسانۂ عبرت ص۹۱-۱۰۱ و قیصر التواریخ جلد دوم ص۸۹

افسانۂ عشق کا قصّہ | مثنوی افسانۂ عشق میں ایک لمبا قصّہ تقریباً پونے چار ہزار بیتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ سرؔور اور نامی نے اس قصّے کے بعض ٹکڑوں کا ناقص خلاصہ لکھا ہے، جو اوپر نقل کیا جا چکا ہو۔ یہاں پورا قصّہ اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

کسی زمانے میں شاہِ زماں نام ایک بادشاہ تھا۔ اس کے ولی عہد بدر الدّجیٰ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام ماہ پیکر رکھا گیا۔ جب وہ چودہ برس کا ہوا تو ایک دن سیر و شکار کے لیے نکلا اور شہر سے باہر جنگل میں پہنچ کر چڑیوں اور جانوروں کا شکار کر کے آرام کرنے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ ایک دردناک آواز سنائی دی۔ شہزادے نے کچھ لوگوں کو دریافت حال کے لیے روانہ کیا، جو یہ خبر لائے کہ پہاڑ کے غار میں ایک نوجوان آہ و زاری کر رہا ہو۔ یہ سنتے ہی ماہ پیکر گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہونچا اور اس نوجوان سے اس کا حال دریافت کیا۔ اُس نے جواب دیا کہ میرا نام مشتری ہو اور میں شہرِ تاباں کا فرماں روا ہوں۔ ایک دن شکار کے لیے ایک ہرن کے پیچھے گھوڑا ڈالا اور آخر بہت فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ تیر کھا کر گرا۔ مگر جب میں اُس کو ذبح کرنے کے لیے اس کے پاس پہنچا، تو وہ ہرن غائب ہو گیا۔ میں خوف اور حیرت کے عالم میں کھڑا تھا کہ ایک ساحر، غفران جادو، اُدھر آ نکلا۔ اس نے بتایا کہ یہ میری بہن کُبران جادو کی سحر گاہ ہو۔ یہاں جو پھنستا ہو وہ کبھی رہا نہیں ہوتا۔ اس کی مدد سے میں طلسمات کی حد سے باہر نکلا۔ کوس بھر راہ طے کی تھی کہ خورشید شاہ کے پائے تخت شہر بہرا انجلا کا پھاٹک ملا۔ میں نے دیکھا کہ لاکھوں آدمی ایک طرف کو چلے جا رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ چلتے چلتے ایک عالی شان محل کی کھڑکی کے پاس یہ مجمع ٹھہر گیا۔ جب آفتاب غروب ہو گیا تو اس کھڑکی کی چلمن اٹھی اور سامنے حسین و جمیل شہزادی سیم تن کا جلوہ دکھا۔ بہتوں کی طرح میں بھی اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ مگر اس کی شرط یہ تھی کہ پرستان کے کنوئیں میں ایک نوجوان قید ہو، جو کوئی اُس کو چھڑا کر میرے پاس لے آئیگا

میں اسی کے ساتھ شادی کروں گی۔ بہتوں نے یہ شرط پوری کرنے کی کوشش کی، لیکن اُس کنویں تک نہ پہونچ سکے۔ میں نے شہزادی کی دو تصویریں کھینچ کر ساتھ لیں اور اس کنویں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ برسوں مارا مارا پھرا مگر پرستان کا راستہ نہ ملا۔ آخر زندگی سے بیزار ہو کر اس غار میں کود پڑا۔ زندہ در گور ہوں، مگر موت نہیں آتی۔ یہ صندوقچہ جو میرے پاس ہے اس میں سیم تن کی تصویریں ہیں۔ جب بے قراری بہت بڑھتی ہے تو میں انھیں تصویروں کو دیکھ کر دل کو تسکین ہوتی ہے۔

ماہ پیکر نے جب یہ حال سنا تو سیم تن کی تصویریں دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ اس کے بے حد اصرار کرنے پر مشتری نے وہ تصویریں دکھا دیں۔ ان کا دیکھنا تھا کہ عشق کا تیر دل میں ترازو ہو گیا۔ بڑی منت سماجت سے سیم تن کی ایک تصویر مانگ لی۔ اور اس کو سینے سے لگا کر اپنے صبا رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر سیم تن کی تلاش میں ہوا ہو گیا۔ فوج اور ہمراہی سب پیچھے چھوٹ گئے۔ انھوں نے شاہزادے کی تلاش میں بہت خاک چھانی مگر وہ نہ ملا۔ آخر مایوس ہوا اور شاہی محل ماتم کدہ بن گیا۔

ماہ پیکر دیوانہ وار جنگل جنگل پھرتا رہا۔ جانوروں اور درختوں سے سیم تن کی خبر دریافت کرتا تھا، پتھروں سے سیم تن کی باتیں کرتا تھا اور سیم تن کی تصویر سے شہر مہر انجلا کا پتا پوچھتا تھا۔ اسی طرح غم کھاتا، دکھ اٹھاتا چلا جا رہا تھا کہ ایک پُربہار سبزہ زار ملا۔ وہاں سایہ دار درختوں کے بیچ میں صاف شفاف پانی کا ایک چشمہ نظر آیا جس کے پاس بہت سی خوبصورت اور خوش رنگ قازیں اور قرقرے دکھائی دیے، پیاس کی شدت تھی، اس نے چشمے سے پانی پینے کا ارادہ کیا۔ قازوں اور قرقروں نے شور مچایا کہ یہ جادو کا چشمہ ہے جو کوئی اس کا پانی پیتا ہے اُسے جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اتنے میں ایک بہت خوبصورت مور ظاہر ہوا جو لوٹ پوٹ کر آدمی بن گیا۔ اُس نے ماہ پیکر کو بتایا کہ یہ جادو کی سرزمین ہے۔ بادشاہ اس مُلک کا سلطان جادو ہے

میں ایک شیر نکلا اور اس گھوڑے کو مار کر اس کا گوشت کھانے لگا۔ ماہ پیکر درخت سے شیر کے آگے کود پڑا تاکہ وہ اس کا کام تمام کر دے۔ لیکن شیر اُس کے گرد پھرنے اور دُم ہلانے لگا۔ ماہ پیکر اُس کو فالِ نیک سمجھ کر محبوبہ کی تلاش میں چل کھڑا ہوا۔ ایک دن تھک کر ایک درخت کے نیچے لیٹا تھا کہ پرندوں کا ایک جوڑا اس درخت پر آبیٹھا اور آپس میں باتیں کرنے لگا۔ ان کی باتیں سُن کر ماہ پیکر کو اُن کی مدد سے اپنا مدعا حاصل ہونے کی اُمید بندھی۔ اس کی التجا پر انھوں نے داؤد جن سے اس کی ملاقات کرادی۔ جن کو ماہ پیکر کے حال پر رحم آگیا اور وہ اس کی مقصد برآری کا وعدہ کر کے اڑا۔ چلتے وقت اس نے ماہ پیکر کو ایک انگوٹھی دی کہ اب تجھ کو کوئی ضرر نہ پہنچ سکے گا۔ جن مور بن کر سیم تن کے باغ میں پہونچ گیا اور اس سے ماہ پیکر کا نام لیے بغیر اس کی مفرط محبت کا مبہم طور سے ذکر کر کے اڑ گیا۔ واپس جا کر اُس نے ماہ پیکر کو یہ خبر دی کہ سیم تن تجھ سے بھی زیادہ تیری محبت میں بے قرار ہو۔ دوسرے دن ماہ پیکر کے اصرار سے وہ پھر مور بن کر سیم تن کے باغ میں پہنچا اور اس سے ماہ پیکر کا حال بیان کر کے اس کے نام خطِ شوق لکھوا لایا۔ پھر اس خط کا جواب سیم تن کے پاس لے گیا۔ اس خط کو پڑھ کر سیم تن کے شوق کی آگ اور بھڑکی۔ آخر اس کی منت سماجت پر ماہ پیکر کو لے آنے کا وعدہ کر کے داؤد جن واپس گیا اور شام کے وقت ماہ پیکر کو اپنی پیٹھ پر سوار کر کے سیم تن کے باغ میں پہنچا دیا۔ وہ اس وقت انتظار کی حالت میں ایک غزل پڑھ کر رو رہی تھی۔ اُس نے اپنے باغ کے ایک بنگلے کا تخلیہ کر رکھا تھا۔ وہیں ماہ پیکر سے ملی۔

وزیرزادی دل پذیر سیم تن کے عشق اور داؤد جن کی آمد و رفت کا حال سیم تن کی ماں سے کہہ چکی تھی اور داؤد کو گرفتار کرنے کے لیے ایک شاہ صاحب، جو علم تسخیر کے ذریعہ سے جنوں پر حکومت کرتے تھے، بلائے جا چکے تھے۔ دل پذیر داؤد کی تاک میں

میرا نام طاؤس جادو ہے۔ میں یہاں کا حاکم ہوں اور ہزار جادوگر میرے ماتحت ہیں یہ قازیں اور قرقرے بھی سب ساحر ہیں۔ پھر اُس نے اس چشمے سے ایک جام بھرا اور سحر کا اثر دور کرنے کے لیے کچھ پڑھ کر دم کیا۔ ماہ پیکر نے وہ پانی پیا اور طاؤس جادو کی ہدایت کے مطابق داہنے ہاتھ کی راہ لی۔ اور پہر بھر میں جادو کی سرحد سے نکل گیا۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ جب دو پہر رات گزری تو ماہ پیکر گھوڑے سے اتر کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کی بے چینی بہت بڑھ گئی تھی۔ روتے روتے غش ہو گیا اور تھک کر سو گیا۔ سوتے میں اس کی قسمت جاگی اور خواب میں سیم تن کا دیدار نصیب ہوا۔

ادھر ماہ پیکر کا یہ حال تھا ادھر سیم تن کا دل ایک دن بہت بے چین ہوا جیسے کوئی اس کا کلیجہ مل رہا ہے۔ اس نے ہمدم وزیرزادی دل پذیر سے اپنی کیفیت بیان کی اور دل بہلانے کے لیے اس کے ساتھ باغ کی سیر کو گئی۔ وہاں گانے ناچنے والیوں نے اپنے اپنے فن کا کمال دکھایا، لیکن سیم تن کا دل کسی طرح نہ بہلا۔ جب ایک پہر رات گزر گئی تو اس پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سو رہی۔ خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ ایک ہولناک دشت میں صرف ایک درخت ہے اور اس کے نیچے ایک حسین نوجوان سیم تن کو خطاب کر کے اپنے دل کا درد بیان کر رہا ہے۔ وہ خوف اور محبت کے مخلوط جذبات کے ساتھ اس کے پاس گئی ہے اور اس کی صورت دیکھ کر اور باتیں سن کر اس پر عاشق ہو گئی ہے۔ آخر اس کے دل کی بے کلی اتنی بڑھی کہ آنکھ کھل گئی اور وہ روتی ہوئی اٹھی۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر سب ساتھ والیاں بے حد پریشان ہو گئیں۔ آخر وزیرزادی دل پذیر کے اصرار سے اس نے اپنا خواب بیان کر دیا۔ دل پذیر نے تسلّی دی اور ماہ پیکر کو ڈھونڈھ لانے کا وعدہ کیا۔

جیسا خواب سیم تن نے دیکھا تھا ویسا ہی ماہ پیکر نے بھی دیکھا۔ آنکھ کھلی تو سیم تن کی جدائی سے بے قرار ہو کر ایک درخت پر چڑھ گیا کہ اُس پر سے گر کر جان دیدے۔ اتنے

لگی ہوئی تھی۔ اس نے سیم تن کی ماں کو خبر دی کہ اس وقت سیم تن اپنے محبوب کے ساتھ باغ کے بنگلے میں لیٹی ہوئی ہے اور داؤد جن بھی وہاں موجود ہے۔ سیم تن کے باپ خورشید شاہ نے شاہ صاحب سے یہ حال بیان کیا اور خواہش کی کہ کسی تدبیر سے داؤد کو گرفتار کیجیے۔ انھوں نے ایک رقعہ لکھ کر ہوا میں اڑا دیا جو دم بھر میں جنوں کے بادشاہ کے پاس پہنچ گیا اور وہ فوراً بہت سے جن ساتھ لے کر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ان کے حکم کی تعمیل میں داؤد کو گرفتار کر لیا۔

ماہ پیکر اور سیم تن دونوں کو داؤد کی گرفتاری کا بہت صدمہ ہوا۔ یکایک ایک ایسی مہیب آواز پیدا ہوئی جس سے زمین ہل گئی اور سفید دیو سیم تن کو اڑا لے گیا۔ یہ دیکھ کر ماہ پیکر تو نالے کرتا ہوا جنگل کو نکل گیا اور سیم تن کے محل میں کہرام مچ گیا۔ ماہ پیکر جنگل میں چلا جا رہا تھا کہ ایک پُر فضا باغ دکھائی دیا اور وہ اس میں داخل ہو گیا۔ وہ باغ طلسم کا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ پتھر کا ہو گیا اور اسی حالت میں چھ مہینے گزر گئے۔ ایک دن اس طلسم کے بادشاہ کی بیٹی سرو سہی اس باغ کی سیر کر رہی تھی کہ اس کی نظر ایک حسین و جمیل انسان پر پڑی جو پتھر کا ہو گیا تھا۔ وہ اس پر عاشق ہو گئی اور سحر کا اثر دور کر کے اس کو پھر آدمی بنا دیا اور اس سے اس کا نام اور اس باغ میں آنے کا سبب دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا کہ میرا نام ماہ پیکر ہے۔ میں سیم تن کے عشق میں مبتلا جنگل میں پھر رہا تھا کہ قسمت اس باغ میں لے آئی اور ایک ساحر نے بے خطا مجھے پتھر کا بنا دیا۔ سرو سہی اس کو ساتھ لے کر چلی اور کئی طلسمی صحراؤں سے گزرنے کے بعد اپنے باغ میں پہنچ کر اس کو ایک بنگلے میں چھپر کھٹ پر لٹا دیا۔ سرو سہی ماہ پیکر پر عاشق تو ہو ہی چکی تھی، اب محبت کے جوش سے بے قابو ہو کر اس کے پاؤں پر گر پڑی اور کہا کہ تم کو سیم تن کا دھیان ہے مگر میں بھی تمھاری محبت میں جاں بلب ہوں، کچھ میرا بھی خیال چاہیے کوئی ایسی صورت نکالو کہ میں بھی تمھارے دل میں جگہ پا سکوں۔ اُس نے جواب دیا کہ اس کی صرف یہی ایک صورت

ہے کہ تم میری سیم تن کو مجھ سے ملا دو۔ پھر تم جو کہو گی وہ منظور ہوگا۔ سرو سہی نے اس مضمون کی ایک تحریر لکھوا لی اور اپنے باپ بادشاہ طلسم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ایک انسان آپ کے پاس فریاد لے کر آیا ہے کہ سفید دیو اُس کی محبوبہ سیم تن کو اڑا لے گیا ہے۔ بادشاہ نے خود ماہ پیکر کی زبان سے اس کی ساری داستان سنی اور ایک دیو کو بھیج کر سفید دیو کو بلوایا، مگر وہ نہ آیا۔ کچھ گستاخانہ کلمے بادشاہ کی شان میں کہے اور اُس دیو کو ایک اندھے کنوئیں میں قید کر دیا۔ جب بادشاہ کو ان باتوں کی خبر ملی تو اُس نے سفید دیو پر فوج کشی کر دی۔ وہ بھی اپنی فوج کے ساتھ مقابلے کو نکلا۔ بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی پتھر اور لوہے کے جان لیوا ہتھیاروں کے علاوہ جادو کے خوفناک حربے بھی استعمال کیے گئے۔ ہزاروں دیو مارے گئے۔ سفید دیو کا لشکر غالب آرہا تھا کہ ماہ پیکر کو داؤد جن کی دی ہوئی انگوٹھی یاد آئی جس کے نگینے پر اسم اعظم کندہ تھا۔ اس کی مدد سے اُس نے ساحروں کا سحر باطل کر کے اُن کو خاک سیاہ کر دیا۔ سفید دیو بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔ اس سے سیم تن کا پتا پوچھ کے بادشاہ ماہ پیکر کو ہمراہ لے کر فوج کے ساتھ اس پہاڑ پر پہونچا جو سفید دیو کا مسکن تھا۔

سیم تن ایک صندوق میں بند تھی۔ ماہ پیکر نے اسم اعظم کی مدد سے اس کا قفل کھولا اور سیم تن کو نکالا۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس لیے ایک ہفتہ اسی پہاڑ پر ٹھہر کر یہ قافلہ واپس گیا۔

بادشاہ کو شاہزادہ ماہ پیکر کی صورت اور سیرت پسند آگئی تھی اور اسی کی وجہ سے اس کو سفید دیو کے مقابلے میں فتح حاصل ہوئی تھی۔ اس لیے اُس نے اپنی بیٹی سرو سہی کی شادی اس کے ساتھ کر دی۔ دو مہینے وہاں قیام کر کے ماہ پیکر سرو سہی اور سیم تن کو دونوں کو ساتھ لے کر شاہانہ شان سے شہر ہرا نجلا کی طرف روانہ ہوا۔

سیم تن کے ماں باپ بیٹی سے مل کر بے حد خوش ہوئے اور جب خورشید شاہ کو معلوم ہوا کہ ایک جنگ عظیم کے بعد سیم تن کو سفید دیو کی قید سے چھڑا لانا ماہ پیکر کا کارنامہ ہے تو وہ اس سے بھی بہت خوش ہو گیا۔ پھر سیم تن نے اپنے باپ سے کہہ کر وزیر زادی کو قید کروا دیا۔ چند روز کے بعد سیم تن کی سفارش پر خورشید شاہ نے انھیں علم تسخیر کے ماہر شاہ صاحب سے کہہ کر داؤد جن کو قید سے رہائی دلا کر بلوا دیا۔ پھر ماہ پیکر کی درخواست پر شاہ صاحب نے سیم تن اور سرو سہی میں میل کروا دیا۔ سیم تن نے سرو سہی کو آٹھ دن اپنے یہاں مہمان رکھا اور اپنے محل کے پاس ایک دوسرا محل اس کے لیے آراستہ کروا دیا۔

ماہ پیکر اس نئے محل میں سو رہا تھا کہ خواب میں اپنے شہر کو ویران، محل کو سنسان اور ماں باپ کو اپنی جدائی میں بے قرار دیکھا۔ آنکھ کھلی تو بہت رویا اور خورشید شاہ سے اپنے وطن جانے اور سیم تن کو ساتھ لے جانے کی اجازت لی۔ خورشید شاہ نے حکم دیا کہ میرا پیش خیمہ آگے چلے اور اسی ہزار پیادے، سولہ ہزار سوار اور چار ہزار شاگرد پیشہ، کل ایک لاکھ آدمی ماہ پیکر کی سواری کے ساتھ جائیں۔ ادھر سفر کا سامان ہونے لگا، ادھر سرو سہی نے اپنے باپ شاہ جنات کو خط لکھ کر سفر کی اطلاع دی۔ وہ ہوا کے تخت پر سوار ہو کر آیا اور اپنی بیٹی، داماد اور خورشید شاہ سے ملاقات کی۔ جب کوچ کا دن آیا تو خورشید شاہ اور شاہ جنات بھی اپنے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ماہ پیکر کے ہم سفر ہوئے۔ جب ماہ پیکر کا وطن صرف پانچ کوس رہ گیا تو اس نے ایک عرضی لکھ کر داؤد کے ہاتھ اپنے باپ بدر الدجیٰ کو بھیجی۔ شاہزادے کی آمد کی خبر سے شہر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے اچھے اچھے کپڑے پہنے دوکان داروں نے اپنی اپنی دکان سجائی اور سارے شہر میں آئینہ بندی کی گئی۔ بدر الدجیٰ خود بیٹے کے استقبال کو گیا اور اس کو اپنے ساتھ لایا۔ ماں بیٹے کو دیکھ کر

خوشی کے مارے غش ہو گئی۔ ماہ پیکر نے سیم تن اور سرو سہی کو پہلے ماں سے پھر باپ سے ملوایا۔ وہ دونوں ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

ایک دن بدر الدجیٰ نے خورشید شاہ کے پاس جا کر ماہ پیکر کا سیم تن کے ساتھ پیغام دیا۔ اس نے منظور کر لیا۔ تمام رسمیں بڑی دھوم سے انجام دی گئیں اور دولہا دولھن باہم عیش و عشرت کے ساتھ بسر کرنے لگے۔

عہد شاہی میں رہس کا تیسرا جلسہ

مثنوی بحر الفت کا ڈراما: ماہ پرور اور مہر پرور کا قصہ

جلسے کی تیاری

رہس کا دوسرا جلسہ تیار کرنے کے کچھ دن بعد واجد علی شاہ نے تیسرے جلسے کی تیاری شروع کر دی اور چالیس پچاس خوبصورت، خوش گلو، ناچ گانے میں مشّاق کسبیاں نوکر رکھیں۔ اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں۔

"کہ آیا جو مجھ کو رہس کا خیال — ہوئی بزم عشرت کی رونق کمال
ملازم ہوئیں کسبیاں خوب رو — غنا پیشہ، رقص آشنا، خوش گلو
نہ سمجھو انھیں ایک دو تین چار — چہل خواہ پنجاہ وہ گل عذار
کوئی نر، کوئی ان میں ہر ہنر — وہ جلسہ ہوا خوب رونق پذیر"[1]

جلسے کا پلاٹ بحر الفت سے ماخوذ

واجد علی شاہ نے جو تین رومانی یا افسانوی مثنویاں کہی تھیں، دریائے تعشق، افسانۂ عشق، بحر الفت، جلال لکھنوی کے والد حکیم اصغر علی خاں داستان گوے شاہی نے ان تینوں مثنویوں کی داستانیں بنائیں[2]۔ ان میں سے قصۂ غزالہ وماہ رو یعنی مثنوی دریائے تعشق

---

[1] عشق نامہ، منظوم ص ۲۹۱

[2] ان داستانوں کے مجموعے کا ایک قلمی نسخہ لکھنؤ میں تھا اور ایک رضا لائبریری، رام پور، میں موجود ہے۔ میں نے جو عبارتیں نقل کی ہیں وہ لکھنؤ والے نسخے سے لی گئی ہیں۔ ادیب

کی داستان کے دیباچے میں، مدح بادشاہ، کے ذیل میں لکھا ہے۔

"رہس ایجاد کیا کہ کنھیا کا رہس مٹا دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
مثنویوں کا قصہ درست کرکے دکھا دیا۔"

اور قصہ ماہ پرویں و مہر پرور یعنی مثنوی بحر الفت کی داستان کے دیباچے میں لکھا ہے:-

"ان دنوں رہس ماہ پرویں اور مہر پرور کا بہت اشتیاق سے حضرت سلطان عالم ملاحظہ فرماتے ہیں۔ اس خاکسار کے خیال میں آیا کہ تو دونوں رہسوں کی داستان تو بنا چکا ہے۔ اس کی بھی داستان بنا کر پیش کش ملازمان شاہی کرے"[1]

ان عبارتوں سے ظاہر ہے کہ واجد علی شاہ کے زمانۂ سلطنت میں شاہی رہس کا تیسرا جلسہ ان کی مثنوی بحر الفت سے ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ شاہی رہس کا آخری جلسہ تھا۔ افسوس ہے کہ اس کے بارے میں کوئی تفصیل کہیں نہ ملی۔

مکالموں میں نثر کا استعمال قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مثنویوں کو ناٹک کا روپ دینے اور ان کو اسٹیج پر پیش کرنے کیلئے ان میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کرنا پڑتی ہوگی اور مکالموں میں زیادہ تر نثر سے کام لیا جاتا ہوگا۔ حکیم اصغر علی خاں کے ایک بیان سے اس قیاس کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔ انھوں نے قصہ ماہ پیکر و سیم تن یعنی مثنوی افسانۂ عشق کی داستان کے دیباچے میں لکھا ہے:-

"ایک روز رہس مبارک میں جو مشتری بنتے ہیں وہ اس حقیر پاس آئے اور کہا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ بطرز داستان کے گفت گو مشتری کی درست کر دیجیے تو بڑا احسان ہوگا۔"

ظاہر ہے کہ داستان کے طرز میں جو گفت گو لکھی گئی ہوگی وہ نثر ہی میں ہوگی۔

---

[1] قصہ ماہ پرویں و مہر پرور۔ حکیم اصغر علی خاں۔

بحر الفت کا قصّہ — مثنوی بحر الفت میں حمد، نعت، منقبت، مناجات وغیرہ کے تینتیس صفحے چھوڑ کر اصل قصّہ کوئی چار ہزار بیتوں میں نظم کیا گیا ہو۔ ذیل میں وہ قصّہ بہت اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

ایک بادشاہ تھا مہر پرور نام، نہایت حسین، اٹھارہ برس کا سن اس کے محل میں بہت سی کنیزیں تھیں، ایک سے ایک حسین، مگر اُسے اپنے حسن پر اتنا ناز تھا کہ کسی اور کا حسن نگاہ میں نہ جنچتا تھا۔ اس کو فکر تھی کہ کوئی اسی کی سی حسین دوشیزہ ملے تو اس کے ساتھ شادی کرے۔ ایک دن چودھویں رات کو چاندنی کی بہار دیکھنے کے لیے وہ اپنے باغ گیا ناچ گانے کی محفل جمی۔ آخر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ محفل برخاست کر کے سو رہا۔

پریوں کے بادشاہ کی بیٹی زہرہ پری ایک شہزادی کو بچپن میں اڑا لائی تھی اور اُسے اپنی بیٹی بنا کر پالا تھا۔ نام اُس کا ماہ پرویں رکھا۔ جب وہ جوان ہوئی تو زہرہ کو اُس کی شادی کی فکر رہنے لگی۔ ماہ پرویں کی خالہ زاد بہن ماہ وش اُس کے ساتھ رہتی تھی اور اُس کی ہمدم اور ہمراز تھی۔ اسی چودھویں رات کو وہ ماہ وش کے ساتھ تخت رواں پر بیٹھ کر سیر کرنے چلی۔ اتفاقاً اس کا گزر مہر پرور کے باغ پر سے ہوا۔ باغ کی غیر معمولی بہار دیکھ کر اس نے اپنا تخت اتارا۔ وہ باغ میں پھر رہی تھی کہ یکایک اس کی نظر مہر پرور پر پڑی۔ دیکھتے ہی ہزار جان سے عاشق ہوگئی۔ اپنی بہت قیمتی ہیرے کی انگوٹھی اس کو پہنائی، اس کی مہر کی انگوٹھی اتار کر خود پہنی اور اپنے محل کو واپس چلی گئی۔

صبح اٹھ کر مہر پرور حوض پر منھ دھونے گیا۔ انگلیوں پر جو نظر پڑی تو حیران رہ گیا کہ یہ ہیرے کی انگوٹھی کہاں سے آگئی اور مُہر کی انگوٹھی کیا ہوئی۔ خادموں نے ہر جگہ تلاشش کی مگر وہاں تھی کہاں جو ملتی۔ ادھر مہر پرور حیران تھا کہ باغ میں چوکی پہرے کے باوجود کون آگیا اور مُہر کی انگوٹھی کیوں لے گیا۔ اُدھر ماہ پرویں بیقرار

تھی۔ خدا خدا کر کے دن کٹا، رات آئی۔ ماہ پروین اور ماہ وش کے تخت مہر پرور کے باغ میں اُترے۔ مہر پرور بھی ماہ پروین کا حسن دیکھ کر اُس پر عاشق ہو گیا۔ دوسرے دن مہر پرور نے باغ کو خوب آراستہ کیا اور ضیافت کا سامان کر کے شام سے ماہ پروین کا انتظار کرنے لگا۔

اتفاقاً ایک جادوگرنی یاسمن نام زنبق ساحر کی بیٹی کا ادھر سے گزر ہوا اس نے اپنا تخت باغ میں اتارا اور مہر پرور کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئی۔ مہر پرور نے بھی جادو کے خوف سے محبّت کا اظہار کیا، مگر وصل سے بچنے کے لیے یہ حیلہ تراشا کہ نجومیوں نے میرا زائچہ دیکھ کر بتایا ہے کہ کسی عورت کے پاس رہنے میں میری جان کا خطرہ ہے۔ ماہ پروین اپنے تخت پر سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ جب یاسمن چلی گئی تو اس نے اپنا تخت اتارا۔ مہر پرور نے یاسمن کے آنے اور عشق جتانے کا حال بیان کیا اور اس بلا سے نجات پانے کی تمنّا ظاہر کی۔ اب ہر رات کو پہلے یاسمن اور بعد کو ماہ پروین آنے لگی۔

چند روز کے بعد ماہ وش کے مشورے سے ماہ پروین نے اپنی بری حالت بنائی اور زہرہ پری کے پاس آئی۔ وہ اس کا حال دیکھ کر بہت پریشان ہوئی۔ ماہ وش نے کہا کہ زنبق ساحر کی بیٹی یاسمن نے اس کا یہ حال کیا ہے۔ ادھر سے ماہ پروین تخت پر جا رہی تھی ادھر سے یاسمن آ رہی تھی۔ اس نے پہلے ماہ پروین کو چھیڑا اور بدزبانی کی، پھر ایسا جادو کیا کہ ہم لوگوں کا تخت اڑ کر مہر پرور کے باغ میں گرا، ماہ پروین کے کپڑے پھٹ گئے اور ہاتھ پاؤں میں چوٹ آئی۔ اس طرح ایک انسان کے سامنے اس نے ذلّت اٹھائی۔ یاسمن کو اپنے اور اپنے باپ کے سحر کا یہ غرّہ ہے کہ وہ کسی کی حقیقت نہیں سمجھتی ہے۔

یہ سُن کر زہرہ کو بے حد غصّہ آیا اور اُس نے منشی سے ایک سخت خط لکھوا کر

برق رفتار قاصد کے ہاتھ یاسمن کے باپ زنبق کو بھجوایا۔ ماہ پروین کو جنگ چھڑ جانے کا یقین ہوگیا اور وہ مہرپرور کے باغ میں پہونچ کر اس کو اپنے یہاں لے آئی۔

زہرہ کا خط پڑھ کر پہلے تو زنبق اپنی بیٹی پر بہت ناراض ہوا اور اس کو سزا دینے پر آمادہ ہوگیا۔ لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ زہرہ کی شکایت بے بنیاد ہے تو اس نے بھی خط کا سخت جواب لکھ کر عقاب جادو کے ہاتھ روانہ کردیا۔ اس کے بعد ادھر زنبق نے ساحروں کی فوج جمع کی اور ادھر زہرہ نے دیووں کا لشکر فراہم کیا۔

زنبق جس طلسم میں رہتا تھا وہاں کے قلعے کی حاکم اس کی بھتیجی گلشن جادو تھی۔ زنبق نے لوح طلسم بھی اسی کے پاس رکھ دی تھی۔ ایک دن یاسمن سے مہرپرور کے حسن کی کیفیت سن کر اور اس کے عشق میں اس کا برا حال دیکھ کر گلشن اس پر نادیدہ عاشق ہوگئی۔ جب دیووں اور ساحروں میں جنگ چھڑ گئی تو گلشن جادو مہرپرور کی پریشانی کے خیال سے بے چین ہوکر اپنی ہمراز نرگس جادو کو ساتھ لیکر سحر کے زور سے اڑی اور مہرپرور کے پاس جا پہونچی۔ وہ بھی گلشن کا حسن و جمال دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوگیا۔ دونوں میں محبت کی باتیں ہوئیں اور چلتے وقت گلشن نے لوح طلسم مہرپرور کو دیدی اور تاکید کردی کہ برق رفتار نام عیار کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا اور لوح کے احکام کے مطابق عمل کرنا۔

لوح مل جانے کے بعد مہرپرور برق رفتار کو ساتھ لے کر طلسم کو فتح کرنے کیلئے چلا۔ طلسم کے جادوگر بھی تھے۔ ہر در پر مشکلوں کا سامنا کرتا ہوا، دھوکے کھاتا ہوا، مصیبتوں میں پھنستا ہوا برق رفتار کی عیاریوں اور لوح کی ہدایتوں کی بدولت طرح طرح کے سحر کا مقابلہ کرتا ہوا ایک کے بعد ایک در فتح کرتا چلا گیا۔ جگہ جگہ زہرہ کی فوج بھی اس کو ملتی رہی۔ جب چوتھا در بھی فتح ہوگیا تو وہ طلسم اس کے قبضے میں آگیا اور زنبق نے اس کی اطاعت قبول کرلی۔ مہرپرور نے زنبق کا ملک اسی کو دیدیا۔

ماہ پروین کا ایک مدت سے کہیں پتہ نہ تھا۔ اب مہرپرور کے حکم سے زنبق اس کی تلاش میں نکلا اور شہروں میں، پہاڑوں میں، بیابانوں میں ڈھونڈتا پھرا۔ آخر کار اس کو پتہ لگا کہ شہپال جادو اس پر عاشق ہو کر اُسے اڑا لے گیا ہو اور ماچین میں ایک دریا کی تہہ میں اُس کو رکھا ہے۔

زنبق سے یہ خبر سن کر مہرپرور ماہ پروین کو اُس قید سے رہا کرنے چلا۔ زنبق نے اُس کو دریا کی تہہ تک پہونچا دیا۔ وہاں اُس کو ایک موتی کا مکان نظر آیا، جہاں ایک مرصع صندوق میں ماہ پروین قید تھی۔ مہرپرور نے صندوق کھولا، ماہ پروین ضعف سے مردہ ہو چکی تھی۔ پہلے اس نے بہت گلے شکوے کیے پھر مہرپرور نے اس کو منا لیا اور اپنے ساتھ لے جا کر زہرہ سے ملا دیا۔ اس کے بعد گلشن اور یاسمن میں میل کروا دیا۔ زہرہ ان سب کو ساتھ لے کر اپنے لشکر سمیت اپنے ملک کو واپس گئی اور سب ہنسی خوشی ایک ساتھ رہنے لگے[1]۔

---

[1] مثنوی میں یہ قصہ کئی جگہ بے ربط سا ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہو کہ جگہ جگہ پر کچھ اشعار چھوٹ گئے ہیں۔
ادیب

شاہی رہس کا ساز و سامان

پہلے رہس کا سامان | واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں رادھا کنھیا کا جو ناٹک تیار کیا تھا، اس میں جو پوشاکیں اور دوسرا ساز و سامان استعمال کیا جاتا تھا، اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے اپنی بادشاہی کے زمانے میں اپنی مثنویوں کے جو تین رہس ناٹک تیار کیے تھے، ان میں سے پہلے رہس کے کھیل کا تفصیلی بیان صرف نواب اقتدار الدولہ نے لکھا ہو۔ اس بیان میں کھیل کے سامان کا ذکر جگہ جگہ آیا ہو ذیل میں وہ متفرق چیزیں یکجا کر کے مناسب ترتیب سے پیش کی جاتی ہیں۔

زنانے کپڑوں کے بیش قیمت ۱ز زنگار کئی سو جوڑے، پریوں کے لیے سلمے ستارے کے کارچوبی پر اور ایسی پُر زر پوشاکیں جن پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی، ڈیڑھ دو سو گلدستے اور اتنی ہی مقیشی چھڑیاں، دیووں کی پوشاکیں اور مقوّے کے چہرے، بادشاہ ملکہ وزیروں، امیروں، نجومیوں، پنڈتوں اور خواجہ سراؤں کی پوشاکیں، پچاسوں خلعت، دو متقابل فوجوں کے لیے سیکڑوں وردیاں اور ہتھیار، ستواں سہ، زچہ خانہ، چھٹی، مانجھا، ساچق، مہندی، برات کی تفریحوں اور جلوسوں کا شاہانہ سامان، چھٹی کے جلوس میں "آگے آگے گھوڑوں پر نوبت بجتی ہوئی اور ان کے بعد عملہ، چوب دار، برچھی والے، بھالے والے، بان دار، خاص بردار۔ کوئی ہزار آدمی"، چھٹی کے سامان میں بچے کے لیے طلائی پالنا، طلائی پلنگڑی، سو کشتیوں میں زیور اور کھلونے سب طلائی، جواہر نگار، مینا کار، بھاری بھاری کرتے ٹوپیاں اور بچے کے ماں باپ کیلئے

بیش قیمت خلعت، مرگ مارنے کی رسم کے لیے طلائی سینی اور طلائی چوکی، متفرق اشیا میں کار چوبی مسند، سلطانی بانات کا سو چوبوں کا بہت بڑا شامیانہ، سنگِ مرمر کا چبوترہ اور اس کا ننگی تلواروں کا زینہ، مصنوعی چیزوں میں صحرا، محل، پرستان، سیب کا پھل دار درخت، ابرق کا بنا ہوا مکان، اور ایک قلعہ، جس کی فصیلوں پر توپیں چڑھی ہوئی تھیں، انہی چیزوں کا تو اقتدار الدولہ نے نام لے لیا ہے۔ اگر کل ساز و سامان کی پوری تفصیل لکھتے تو ایک دفتر تیار ہو جاتا۔

دوسرے رہس کا سامان | دوسرے رہس کے کھیل کا بیان امانت، سرور، تامی اور صغیر نے کیا ہے۔ ان مصنفوں نے اس کھیل کے ساز و سامان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

امانت لکھنوی شرح اندر سبھا میں لکھتے ہیں:

"صلّ علیٰ کیا رہس مبارک طبع سلیمان جاہ سے ایجاد فرمایا کہ پریوں کا ہوش اڑایا اور راجا اندر کے اکھاڑے پر حرف آیا ....

...... پریوں کا عجب انداز ہے، ..... جواہر نگار سب کے پر ہیں، مرصّع چوٹیاں بالائے سر ہیں ..... افشاں کے ستارے ناچ کی جھل بل میں تاروں سے دہ چند چمکتے ہیں۔ جڑاؤ بالیاں پریوں کے کانوں میں جواہر کی کان ہیں .... بندے یاقوت کے کان کی لو سے اخگر کے مانند روشن ہیں بجلیاں ہیرے کی چمک چمک کر برق جہندہ پر چشمک زن ہیں، حلقہ سونے[۱] کا زلف کے بال دلوں پر تلوار کے مانند کستا ہے۔ موتیوں کے جھالوں پر ابر گیسو میں نور کا مینھ برستا ہے۔

"گلے میں ہر ایک کے .... جڑاؤ طوق ہے۔ ہیروں میں طوق کے .... نور کا عالم ہے۔ بازوؤں پر سونے کے جڑاؤ جوشن ہیں۔

۱؎ اسی کتاب میں پری خانے کی تصویر میں بیٹھی ہوئی دو پریوں کے سروں پر طلائی حلقے موجود ہیں۔ ادیب

نو، تن نو رتن سے سات ستاروں کے مانند روشن ہیں۔ ہاتھوں میں کنگن ... ہیرے کے کڑے ہیں ... کنگن اور کڑوں کے بیچ میں ... جڑاؤ نوگریاں ہیں۔

"پوشاک میں پریوں کی وہ تیاری ہو کہ ستاروں پر رشک سے رات بھاری ہو۔ بیل، گوکھرو، ٹھپکی، کرن کی وہ بوچھار ہو کہ نازنینوں کو پوشاک کا بوجھ سنبھالنا دشوار ہے۔ چمکی کا ستارہ چمکتا ہے، کندنی مال روشنی میں دمکتا ہے۔ سلمے کا کھپا ستاروں کی بھرتی ہے۔ زردوزی پر نگاہ نہیں کام کرتی ہو۔ زہرہ جبینیں جب رقص میں چلتے پھرتے ہیں، ہیرے ستارے چاندنی پر گرتے ہیں ...

... حسینوں کا ناچ، توڑوں کا مار، سونے چاندی کے گھنگھروؤں کی جھنکار، پریوں کا ہاتھ سے ہاتھ ملا کر، ہالۂ مہتاب کی صورت بنا کر گل دستے لیے ہوئے ناچنا عجب لطف دکھاتا ہے .... سرخ دوپٹہ بھاری محفل میں تنتا ہو، شفق کا جواب بنتا ہو، جس میں سے نور چھنتا ہے۔ زہرہ جمال مشتری خصال کس پھرتی سے ناچ ناچ کر اس کے تلے سے نکل جاتے ہیں، گویا برج آتشی سے ستارے چمک چمک کر باہر آتے ہیں۔ طبلے کی تھاپ فلک میں سماتی ہے، سارنگیوں کی آواز زمین کو ہلاتی ہے، جوڑی کی صدا ناچ کے تال پر دانت کرکراتی ہے"[۱]

سرور نے رہس والیوں کی پوشاک کا ذکر ان کے لفظوں میں کیا ہے۔

"لباس پُر زر یعنی جوڑے زنجبن، بنت، گوکھرو، لچکا لنگا۔ چٹکی کی لوٹ، مسالے کی کرتی، انگیا، پاجامے سوسوگز اطلس کے مغرق بہت بھاری"[۲]

نامی نے رہس کے سازوسامان کا ذکر یوں کیا ہے:۔

---

[۱] اندرسبھا مع شرح ص۱۷۸ حاشیہ [۲] فسانۂ عجائب ص۱۰۱

"سارا جلسہ، لوازمے اس کے، حقیقت دیو، پری، فقیر و جوگی، وزیر و
بادشاہ، کھپّر اور انیڈوا، باغ اور پہاڑ، زچہ خانے، چھٹی وغیرہ کا ہو بہو
ویسا ہی بنوایا۔ لاکھوں کی تیاری ہوئی۔ پریوں کی پوشاک زرّیں،
کارچوبی بہت کچھ لگ گئی۔ عمدہ زیور بنائے![1]

پھر رہس کے قصّے کا خلاصہ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:-

"سارا اس کہانی کا بیان ذرہ ذرہ مع سامان حضرت نے بنوایا۔ ہو بہو
نقل کو اصل کر دکھایا جنگل اور پہاڑ شکار گاہ طلسمی اور جن و پری، جادو کا
حوض، توتے کا جوڑا، فقیر، بیابان، سارا پرستان بنوایا، سب موجود کیا۔
صاف نقشہ اس کا اتارا![2]

صغیر نے رہس کے سامان میں جواہرات کی کثرت دکھائی ہے کہتے ہیں:-

"عجب اُن کے زیور جواہر کے تھے — پری کے لیے پر جواہر کے تھے
مزیّن سراپا تھے سب مرد و زن — جواہر کے، اس کھیل میں تھے ہرن
کوئی ان میں تھا شاہ، کوئی وزیر — رہس میں بھی تھا پُر جواہر سریر"[3]

ان بیانوں سے رہس کے اداکاروں کے زیوروں کی تفصیل اور پوشاکوں کی نوعیت کا کسی قدر علم ہو جاتا ہے۔ دوسرے سامانوں میں نامی نے کھپّر، انیڈوا، باغ، جنگل، پہاڑ، طلسمی شکار گاہ، جادو کا حوض، توتے کا جوڑا، بیابان اور پرستان کا نام لیا ہے اور صغیر نے جواہرات کے پر، جواہرات کے ہرن اور مرصّع تخت کا ذکر کیا ہے۔ سازو سامان میں امانت نے طبلہ، سارنگی اور مجیروں کا نام لیا ہے اور غالباً صرف انھیں سازوں سے کام لیا جاتا تھا۔

---

[1] مرقع خسروی [2] مرقع خسروی ورق ۲۰۵ ب [3] مثنوی آئین اختر ص ۱۴۴، ۱۴۵

رہس میں باغ اور جنگل | رہس کے اس جلسے کے سازو سامان کی تفصیل جونا تھی نے بتائی ہے اس میں باغ، جنگل اور پہاڑ کا بھی نام لیا ہو۔ اور سرور کا لکھا ہوا رہس کے جلسے کا بیان جو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں، اس میں یہ جملہ بھی ہے :-

"جب ..... ناچ گانے کا اختتام ہوا تو باغ و صحرا کی باری آئی"

یہاں سرور کا وہ طولانی بیان غیر ضروری ٹکڑے حذف کر کے پیش کیا جاتا ہو جس سے اس باغ اور جنگل کی حقیقت معلوم ہوتی ہے :-

"ایک باغ تازہ دیانت الدولہ بہادر کی معرفت بنوایا ہو۔ کیا کیا رنگین گل کھلایا ہو! ۔۔ گل و بار ہر دم تیار۔ نہیں معلوم ہوتا ہو کس فصل میں پھولتے پھلتے ہیں ..... سرو و شمشاد دیکھ کر خجل ہیں، غیرت سے پا بہ گل ہیں ..... جو بار جس شاخ میں پختہ یا خام ہو، نہ ہوا کا ہوا خواہ، نہ حرارت آفتاب کا کچھ کام ہو ..... بہار جاودانہ ہو ۔۔ خزاں کا خوف و خطر نہیں۔ صیاد کیسا، باغبان کا گزر نہیں ..... گلشن دوراں میں ہزار بار خزاں آئے جائے، دخل کیا جو اس کا رونگٹا میلا کر سکے یا پتی مرجھائے۔ سر بر شاخ طائران گستاخ جلوہ گر، ایک سے ایک بہتر۔ گویا بولا چاہتے ہیں اشعار بستہ باغ کی صفت میں کھولا چاہتے ہیں۔ نہ پٹریوں پر بیلچے کی ضرورت نہ کیاریوں میں پانی کی احتیاج۔ نہ وہاں کے جانوروں کو مرگ کا خوف نہ زندگانی کی احتیاج۔ حسن و خوبی میں فرد ہیں، جوڑا نہیں ملتا، بے نظیر ہیں، سچ تو یہ ہے کہ طائر تصویر ہیں۔ نہ خواہش دانہ، نہ کاہش دام، نہ قید قفس سے سروکار ہے، باغ کی زینت میں الجھے ہیں، ملنے مد غیر جنبش دشوار ہے"[۱]

---

[۱] فسانۂ عبرت ص ۱۰۲-۱۰۵

"ایک طرف جنگل ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درخت گنجان، جڑ تحت الثریٰ میں، سر اسمسر آسمان، کہیں جھنڈیاں، کہیں جھاڑیاں، کسی طرف ٹیلا ٹیکرا، کہیں پہاڑیاں، کوئی پہاڑ بلند، رشک کوہ الوند، اس میں غار ہے، نالۂ عاشق زار وہاں سے آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوسوں سنسان ہو، سیر گاہ بنی جان ہو۔ کہیں وحش، کسی جا طیر ہیں، پرندے درندے سرگرم سیر ہیں۔ ہرن خوش چشم، صاحب جمال ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جست وخیز کم کرتے ہیں، مگر جیتونوں سے پیدا ہو کہ اپنے سائے سے رم کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ بھاگنے والے بڑے ہیں، ثبات قدمی کے باعث محو تماشا کھڑے ہیں۔ شیر اس طرح کا مہیب، اگر غصے میں ڈکارے یا غرائے، اسدِ چرخ روبہ بازی کرنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گلے میں زنجیر نہیں، کھلے بندوں، اسیر نہیں۔ اصالت کی خوبی دیکھیے، آہو گیر نہیں اس جنگل کے دو دوام انسانوں سے رام ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کھانے پینے کی چیزیں ان پر حرام ہیں۔ جنگل سرسبز، انتہا کا دلچسپ، فرحت افزا ہے، صحرا وسیع، پُر فضا، دل کشا ہے۔ اس کی سیر میں از خود رفتہ، سہو محو کھڑے ہیں۔ نہ کھاتے پیتے ہیں، نہ جاگتے ہیں، نہ سوتے ہیں، ستون کی طرح قدم زمین میں گڑے ہیں۔ نہ حرص ہو، نہ آز ہو، نہ بول ہے نہ براز ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ہوا کھا کے پانی کی خواہش نہیں رکھتے۔ اپنے مقام سے جست وخیز نہیں کرتے۔ یہ حکایت نادر روزگار ہے، دشتی آب وتاب پر اُن کی رونق کا دار ومدار ہو۔ طلسم کی کیفیت سنئے یہ معاملہ دونا ہے، سحر سامری کا صاف نمونہ ہے"[1]

---

[1] فسانۂ عبرت ص ۱۰۵-۱۰۶

سرسری نظر پڑھنے والے کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ سرورؔ نے اپنے مخصوص اسلوب میں بہت مبالغے کے ساتھ کسی سچ مچ کے باغ اور جنگل کا نقشہ کھینچا ہے لیکن غور کرنے سے ان دونوں کا مصنوعی ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔

یہ باغ اور جنگل دکھانے کے لیے مختلف چیزوں کے مصنوعی درخت، جانور، پہاڑ وغیرہ بنا کر کھڑے کر دیے جاتے تھے۔ ہندوستان کے قدیم ڈراموں کے کھیل میں بانس کے ڈھانچوں پر چٹائی، کھال اور کپڑا منڈھ کر پہاڑ، گاڑیاں، رتھیں، ہاتھی، گھوڑے اور دوسرے جانور بنا کر اسٹیج پر پیش کیے جاتے تھے۔ اُن کے بنانے میں موم، لاکھ، ابرق، اون اور درختوں کی چھال سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ مورتیں مٹی، لکڑی اور لاکھ کی بھی بنائی جاتی تھیں اور اُن کو چلتا ہوا دکھانے کے لیے ان میں ڈوری باندھ کر پردے کے پیچھے سے کھینچتے تھے۔ آدمی بھی جانوروں کی کھالیں پہن کر جانور بنتے تھے[۱]۔ واجد علی شاہ ان امور میں قدیم ہندوستانی اسٹیج کی تقلید کرتے تھے۔ ان کے اس رہس میں آدمیوں کا جانور بننا بھی صغیرؔ کی اس بیت سے ظاہر ہوتا ہے:-

"کوئی ان میں طاؤس جادو بنا ۔۔۔ کوئی آدمی شکلِ آہو بنا"[۲]

یعنی رہس کے اس کھیل میں کوئی آدمی جادو کا مور بنتا تھا اور کوئی ہرن کا بھیس بناتا تھا۔

تیسرے رہس کا سامان | تیسرے رہس کے کھیل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا لیکن قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ساز و سامان بھی کچھ ایسا ہی ہوگا جیسا پہلے اور دوسرے رہس میں استعمال کیا جاتا تھا۔

۱؎ ہندوستانی تھیٹر (بزبان انگریزی) چ۔ ب۔ گپتا، بنارس، ۱۹۵۴ء

۲؎ مثنوی آئینِ اختر۔ ص ۴۸

رہس کا عملہ رہس کا کھیل تیار کرنے کے لیے کس کس طرح کے آدمی درکار ہوتے تھے۔ اس بارے میں ظہیرالدین بلگرامی لکھتے ہیں کہ رہس کی حکایتوں کے لیے ہر طرح کے لوگوں، منجموں، رمالوں، عالموں، فقیروں، معلّموں، مؤدّبوں اور رہس کے شہزادوں کے اتالیقوں کی حاجت ہوتی تھی۔ ان شہزادوں کی ولادت، مکتب، سال گرہ اور ختنے کی تقریبوں میں اس قسم کے لوگوں کی بہت ضرورت پڑتی تھی۔ ہر طرح کے ارباب نشاط اور شاعروں کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔ ان کے علاوہ ارباب نشاط کو رہس کے مضامین کے متعلق مثنوی کے اشعار سکھانے کے لیے ذی استعداد لوگوں کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی تھی۔ اُن کی اصل عبارت یہ ہے:۔

"در آں حکایات معہ (کذا) رہس مبارک حاجت ہر قسم ارباب از منجم و رمّال و علما و فقرا بنام سبز قبا[1] و معلّمان و مؤدبان و اتالیق برائے تعلیم شاہزادگانِ رہس درکار می شدند۔ علیٰ ہذا در تقاریب میلاد و مکتب و سالگرہ و ختنہ، شاہزادگان رہس ضرورت ایں قسم مردم ناگزیر تر۔ و اصناف ارباب نشاط و شعرا را خود حدے نیست۔ علاوہ بر ایں برائے تعلیم اشعار مثنویات متعلقۂ مضامین رہس بہ عملۂ ارباب نشاط نیز مردمان صاحب استعداد ناگزیر تر[2]۔"

یہی مصنف رہس کے مصارف کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"لکوک روپیا بہ مشاہرہ و انعامات و ملبوسات و سامان متعلقہ

۱۔ رہس میں فقیر سبز قبا کہلاتے تھے۔

۲۔ [illegible] ۱۶۵

رہس و دیگر مصارف رقص و سرود و ما یتعلق بہ بصرف در آورند۔"[۱]

یعنی واجد علی شاہ رہس والوں کی تنخواہوں، انعاموں، پوشاکوں اور رہس کے سامان پر اور رہس سے متعلق ناچ گانے کی مد میں لاکھوں روپیہ صرف کرتے تھے کئی ہم عصر مصنفوں کے بیان سے شاہی رہس کے ساز و سامان کی جو نامکمل فہرست ہمارے سامنے آگئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رہس میں زنانی پوشاکیں بہت قیمتی کپڑوں کی زرکار ہوتی تھیں، جن میں سیروں سچے مال مسالے کی کھپت ہوتی تھی۔ زیور سب اصلی سونے کے ہوتے تھے، جن میں سچے موتیوں اور قیمتی جواہرات کا جڑاؤ ہوتا تھا۔ پوشاکیں اور زیور سیکڑوں کی تعداد میں درکار ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی چیزیں طلائی اور مرصع ہوتی تھیں۔ مثلاً غزالہ کی چھٹی میں جو سامان آیا اس میں پالنا اور پلنگڑی طلائی اور کھلونے طلائی، زرنگار، مرصع کار تھے اور مرگ مارنے کے موقع پر سینی اور چوکی طلائی تھی۔ پریوں کی جوتیاں اور پر جڑاؤ ہوتے تھے۔

واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں رادھا کنھیا کا چھوٹا سا رہس جو تیار کیا تھا اس میں صرف کنھیا کا مکٹ، بانسری اور دوسرے لوازمہ کئی لاکھ روپے میں تیار ہوئے تھے اور سب سامان موجود ہونے کے باوجود فقط پوجے کا سامان اور روپ کے ستارے پانچ سو روپے کے خریدے گئے تھے۔ اگر اس سے شاہی رہس کے کل لوازم کی لاگت کا تخمینہ کیا جائے تو لاکھوں سے گزر کر کروڑوں تک کی نوبت آجائے گی۔ اتنی قیمتی پوشاکوں اور زیوروں کے ساتھ کوئی ڈراما شاید دنیا کے کسی اسٹیج پر بھی نہ کھیلا گیا ہوگا۔

[illegible]

قدیم ہندوستان میں بھی شاہی اسٹیج راجاؤں کے محلوں میں ہوتا تھا اور تماشائیوں میں صرف راجا، رانیاں، وزرار، اہل دربار اور درباری شعراء ہوتے تھے۔ مگر اس کو لکھنؤ کے شاہی اسٹیج سے کوئی نسبت نہ تھی۔ وہاں ناٹک کے کرداروں میں راجا اور خاص کر ممتاز خواتین سر، کان، ناک، گلے، کمر، کلائی، بازو، ہاتھ اور پاؤں میں ہر طرح کے زیور پہنتی تھیں۔ لیکن یہ زیور اصلی نہیں ہوتے تھے، تانبے، ابرق اور موم کے بنے ہوئے تھے۔ جو دور سے چمکتے تھے۔ اسٹیج کے مسلّمہ قواعد میں یہ بھی تھا کہ سونے کے زیور نہ پہنے جائیں اور اگر کبھی پہنے جائیں تو ٹھوس نہ ہوں ان کے اندر لاکھ بھری ہو اور جواہرات کا جڑاؤ زیادہ نہ ہو۔ مکٹ سونے اور جواہرات کے نہ ہوں، تانبے کے پتّروں سے بنائے جائیں[1]۔ واجد علی شاہ اکثر امور میں قدیم ہندوستانی اسٹیج کی روایتوں پر عمل کرتے تھے۔ مگر ان کا شاہانہ مزاج اس بات پر راضی نہ ہو سکا کہ رہس کے کھیل جو انھوں نے اپنا شوق پورا کرنے کے لیے تیار کیے تھے ان میں تانبے، پیتل، ابرق یا موم کے زیور استعمال کیے جائیں اور شاہی تاج تانبے کے پتّروں کے بنائے جائیں۔

اردو ڈرامے کا پہلا تھیٹر یا تماشا خانہ

میں نے معتبر اور مسِن بزرگوں سے سنا ہے کہ رہس کے جلسوں کے لیے قیصر باغ میں ایک مخصوص عمارت بنائی گئی تھی، جس کا نام رہس منزل تھا۔ اس کا مفصّل حال تو کسی نے لکھا نہیں، لیکن بعض تحریروں میں ضمناً اس کا ذکر آ گیا ہے۔ نامی نے رہس کے ایک جلسے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے!

۱۔ ہندوستانی تھیٹر (بزبان انگریزی) باب ۔ گیا ...

"حضرت ... ... رہس منزل کے کمرے پر
علانیہ اور بے محابا خلق اللہ کو دیکھنے اور دکھانے کو سامنے رونق افروز
ہوئے"[۱]

رہس کے ناچ کے بیان میں جلال لکھنوی کی ایک نظم جو اوپر نقل کی جا چکی ہے اس
میں یہ شعر بھی ہو!۔

"رہس منزل اس نے بنائی نہ تھی   یہ بات اس کے دل میں بھی آئی نہ تھی"[۲]

قیصر التواریخ میں ہے کہ واجد علی شاہ نے معزولی کے بعد مولوی غلیل الدین خاں
کو کاکوری سے لکھنؤ طلب کیا اور اپنے قیصر رہس منزل میں رہنے کا حکم دیا[۳]۔
یہ رہس منزل سب سے پہلا تھیٹر یا تماشا خانا تھا، جو اردو ڈرامے کے لیے تیار
کیا گیا۔ افسوس ہو کہ اس عمارت کی ساخت اور اس کے فرنیچر اور آرائش وغیرہ
کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔
صفیر نے واجد علی شاہ کے لکھنؤ سے چلے جانے کے بعد شہر کی بے رونقی اور
شاہی محلوں کی ویرانی کے سلسلے میں لکھا ہو!۔

"کہاں عشق منزل ہیں وہ بھیڑ بھاڑ   کہ اب تو رہس منزلیں ہیں اجاڑ"[۴]

اور ناؔمی کا بیان ہو!۔

"جلسے اس کے (یعنی رہس کے) قیصر باغ شاہ منزل میں قرار
پائے۔ رہس کے مکانات بنے اور پری خانے جدا جدا تیار ہوئے"[۵]

---

۱ مرقع خسروی قلمی   ۲ کتاب ہذا صفحہ ۹۴-۹۵
۳ قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۵۴   ۴ آئین اختر صفحہ ۱۱۰
۵ مرقع خسروی قلمی

صنیفؔ کے شعر میں "رہس منزلیں" اور ناسخؔ کے بیان میں "رہس کے مکانات" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کئی عمارتیں رہس کے لیے مخصوص تھیں، مگر کیا یہ سب عمارتیں رہس منزلیں کہلاتی تھیں؟ بہر حال جس طرح اردو کا پہلا ڈراما لکھنے اور ڈرامے کا پہلا کھیل تیار کرنے کا فخر واجد علی شاہ کے لیے ہے اس طرح اردو ڈرامے کے لیے پہلا تھیٹر تعمیر کرنے کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے۔

پانچویں منزل : قیصر باغ کا جوگیا میلا

میلے کی بنا — ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ واجد علی شاہ کی پیدائش کے وقت سے ان کی والدہ جوتشیوں کی ہدایت کے مطابق ہر سال اُن کو جوگی بنایا کرتی تھیں اور یہ سالانہ رسم محل کے اندر انجام دی جاتی تھی۔ واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں اس رسم کو رقص و سرود کے جلسے میں تبدیل کر دیا، جس میں قریبی عزیزوں اور مخصوص مصاحبوں کو بھی شرکت کی اجازت تھی۔ بادشاہ ہونے کے بعد بھی چند سال تک یہ جلسہ اسی طرح ایک نجی صحبت کی صورت میں ہوتا رہا۔ ۱۲۶۹ھ میں واجد علی شاہ نے اس کو ایک میلے کی شکل دے کر سارے شہر میں شرکت کی دعوت دی۔ یہ میلا قیصر باغ میں ساون کے مہینے میں ہوتا تھا، واجد علی شاہ کے جوگی بننے کی رسم سے اس کی بنیاد پڑی تھی اور اس میں شریک ہونے والے سب لوگ گیروے رنگ کے فقیرانہ کپڑے پہنتے تھے۔ ان وجہوں سے اس کا ذکر ان ناموں سے ملتا ہے، شاہی میلا، سلطانی میلا، قیصر باغ کا میلا، ساون کا میلا، جوگیا میلا، جوگیانہ میلا اور چوں کہ ناچ گانے کی محفلیں اس میلے کی خاص خصوصیت تھی، اس لیے اس کو ساون کا جلسہ بھی کہتے تھے۔

اس میلے کا تفصیلی یا اجمالی بیان خود واجد علی شاہ نے اور اُن کے کئی ہمعصر مصنفوں نے نظم و نثر میں کیا ہے۔ ان بیانوں کے ضروری اقتباسات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

واجد علی شاہ کا بیان

سنو اک ذرا اپنے وفاؤں کا حال   کہ بنتا ہوں جوگی میں ہر ایک سال
مری بیگموں سے بھی دو تین چار   نئی جو گنیں بنتی ہیں گل عذار

ہوئی سال ہجری کی جب بازگشت   بقدر ہزار و دوصد شصت و ہشت [۱]
وہ ساون کے دن موسم برشکال   جدھر دیکھیے سبز و خرم نہال
دلوں میں عجب جوش پیدا ہوئے   طرح دار جوگی ہویدا ہوئے
مرے ساتھ جوگی بنے سب کے سب   ولی عہد ذی جاہ عالی نسب
وہ نواب [۲] صاحب وہ رجبیں قدر   وہ جنرل [۳] جو ہیں حسن میں ثانی بدر
تماشا کناں اور تو بیگمیں   بنیں جو گنیں اُن میں دو بیگمیں
تماشا ادھر آج [۴] بیگم کا جوگ   ادھر اچھے صاحب [۵] کے مشتاق لوگ
دیا حکم اُس دن یہ میں نے نیا   کہ امسال تیاریاں ہوں سوا
زن و مرد و اطفال و برنا و پیر   چہ ادنیٰ چہ اعلیٰ بنیں سب فقیر
محل بیگمیں اور ازواج سب   اعزا امیر اور محتاج سب

۱۔ اس بیت کا مطلب یہ ہے کہ جب ۱۲۶۸ ہجری کا سال پلٹا یعنی ختم ہوا اور ۱۲۶۹ھ آگیا۔ نظم کی پابندیوں کی وجہ سے بات کو ذرا گھما کر کہنا پڑا ہے

۲۔ واجد علی شاہ کے وزیر نواب علی نقی خاں

۳۔ شہزادہ مرزا فریدوں قدر جن کو بچپن ہی میں جرنیل کا منصب دیا گیا تھا۔

۴۔ ایک طوائف جو گانا ناچنا خوب جانتی تھی، ۱۲۶۳ھ میں واجد علی شاہ کے گھر بیٹھی، سات سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی (عشق نامہ منظوم صفحہ ۶۵۵، ۶۵۶)

۵۔ ایک طوائف جو گانے ناچنے میں مشتاق تھی، اپنی خواہش سے بادشاہ کے گھر پڑی، سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی (عشق نامہ منظوم صفحہ ۶۵۲)

یہی بھیس ہو اہلِ بازار کا | یہی جوگ ہو اہلِ دربار کا
ملازم ہوئے جتنے ہیں حق شناس | وہ بالکل فقیرانہ پہنیں لباس
کرے گا نہ جو یہ لباس اختیار | وہ زنہار میرا نہیں دوستدار
غرض ہو گیا سارا عالم فقیر | یہی رخت سب کو ہوا دل پذیر[1]

اقتدار الدولہ کا بیان
"گیارھویں شوال کی، روز چہار شنبے کا تھا جو حضرت واجد علی شاہ جم جاہ نے میلا قیصر باغ میں کیا تھا۔ تو اس کو دھیان کیجیے کہ جتنی کوٹھیاں قیصر باغ میں تھیں سب میں تیاری تھی اور ہزارہا جھاڑ اور دیوارگیریاں روشن ہوئیں تھیں اور ہر جا ناچ ہو رہا تھا اور اذن عام تھا کسی کی روک ٹوک نہ تھی اور حکم تھا جو یہ میلا دیکھنے آئے وہ شنگرفی کپڑے پہن کر آئے۔ تو جتنی خلقت باغ میں آئی تھی سب کے کپڑے شنگرفی تھے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ تک، امیر سے فقیر تک کی پوشاک شنگرفی تھی۔ حضرت قدر قدرت نے بھی شنگرفی پوشاک پہنی تھی۔ تو جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی سوائے شنگرفی پوشاک کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

"اور کثرت تو خلق کی اس قدر تھی کہ خود مؤلف نے دیکھا تھا کہ جب دروازے پر قیصر باغ کے ہوادار مؤلف کا پہونچا تو چوبداروں نے اور خاص برداروں نے حضرت کے بھیڑ کو ہٹایا تھا۔ تو اس قدر دروازے میں خلقت کی بھیڑ تھی کہ کئی سے جوتا خلق کا رہ گیا تھا اور بھیڑ ہٹ نہ سکی تھی۔ اور باغ کے اندر کا تو حساب ہی نہیں۔ اور اندر باغ کے ہر جا دکانیں تھیں، کہیں تنبولی کی اور کہیں حلوائی کی اور کہیں بھنگیڑنوں کی۔ اور

---

[1] عشق نامہ منظوم ص ۶۸۷-۶۸۹

خوانچے والوں کا تو حساب نہ تھا کہ خوانچے لیے پھرتے تھے۔ اور جتنے دکان دار تھے سب کی پالیں بھی شنگرفی رنگ کی تھیں۔

"غرض تین دن تک برابر یہی میلا رہا کہ قدرت خدا کی یاد آتی تھی۔ اور جس کی صبح کو رخصت ہوگی اُس شب کو حضرت قدر قدرت قیصر باغ میں مشرق کی طرف جو کمرہ تھا اس میں رونق افزا تھے۔ اُس کمرہ کے بیچ کے درجے میں کرسی پر بیٹھے تھے اور کٹہرے پر ہار پھولوں کے پڑے تھے۔ اور کمرے کے نیچے مرزا ولی عہد بہادر اور سب شہزادے بیٹھے تھے... [1] اور حضرت قدر قدرت نے ایک سینی میں افشاں بھیجی تھی اور فرما بھیجا تھا کہ ایک ایک کے منھ پر ملے تو ہر ایک نے یہی کیا تھا .... تو تمام صبا میں افشاں اڑائی گئی۔ تو کیا بیان کروں کہ اس وقت جو کیفیت اور بہار تھی۔ اور یہ جلسہ کوئی دو گھڑی رات رہے تک رہا۔ بعد اس کے سب رخصت ہوئے اور میلا تمام ہوا [2]"

بیخود لکھنوی کا بیان

کیا ہو ذبس خاکساری شعار	بنا کرتے ہیں جوگی بھی شہر یار
غرض اب کی وہ دن جو آیا قریب	تو سارے زمانے کے جاگے نصیب
وہ دن صبح جنت کا ہو جس میں نور	وہ دن شام ہو جس کی گیسوئے حور
اسی دن کا یوم المبارک [3] ہو نام	اسی دن کے عیش و طرب ہیں غلام
ہوئی آمد آمد جو اُس روز کی	دلوں میں خوشی آ کے مہماں ہوئی

---

[1] یہاں شہزادوں کے نام لکھے ہیں جن میں اقتدار الدولہ کا نام بھی ہو۔

[2] تاریخ اقتداریہ ص ۲۸۰-۲۸۲

[3] یوم المبارک کی توضیح اسی کتاب کے صفحہ ۱۸۲ میں دیکھیے۔

یہ فرمایا حضرت نے خدام سے — جو اس وقت بزمِ معلےٰ میں تھے
جسے ہم سے ہوگی محبت کمال — بدل جس کو ہوگا ہمارا خیال
جسے ہوگا کچھ روئے نرگیس کا پاس — رنگے گا وہ شنجرنی اپنا لباس
اگرچہ یہ خلوت کی تھی گفت گو — مگر مشتہر ہو گئی چار سو
زبس جانِ عالم ہیں جانِ جہاں — سمجھتے ہیں سب انکو روحِ رواں
جو ہیں اُن کی مرضی سے واقف ہوئے — لباس اپنے سب نے شفق گوں کیے
کہ اتنے میں آیا وہ روزِ طرب — گھروں سے روانہ ہوئے سب کے سب
درشہ پہ پہونچے بصد امتیاز — ہوئے لطفِ حضرت سے سب سرفراز
رعایا جو پیرو ہوئی شاہ کی — اجازت حضوری کی سب کو ملی
ہوئے مجتمع سب خریدارِ عیش — ملا حکم گل گشت گلزارِ عیش
جب آیا نظر باغ نزہت سرشت — ہوا شبہ سب کو یہی ہے بہشت
ملے لفظِ قیصر اگر باغ سے — تو نام گلستان شاہی کھلے "[1]

میلے کی کیفیت

"پلا جلد ساقی مجھے جامِ مے — کہ اب سیر میلے کی منظور ہے
وہ میلا کہ ہو جس کی عالم میں دھوم — وہ میلا کہ لاکھوں کا جس میں ہجوم
وہ گلشن جو ہے میکدہ قیصر کا باغ — وہ گلشن دلِ خلد ہو جس سے داغ
اُسی باغ میں ہو عجب دھوم دھام — ہزاروں کا گلشن میں ہو ازدحام
لبِ چشمۂ حسن[2] ہر نوجواں — پئے کسبِ فرحت ہو جلوہ کناں

---

[1] مثنوی جلوۂ اختر ص؟
[2] چشمۂ حسن قیصر باغ کی اُس نہر کا نام ہے جس کے پاس اب میوزک کالج کی عمارت واقع ہے۔ ادیب

اور اک سمت سلطان والا گہر — رہیں دیکھتے ہیں بہ صد کرّ و فر
مؤدّب ہیں استادہ خدّام شاہ — ہجوم کواکب ہے نزدیک ماہ
رہیں دیکھ کر شہ جو فارغ ہوئے — لگے کھیلنے رنگ خدّام سے
یہ طغیانی رنگ عشرت ہوئی — شفق بن گئی چاندنی فرش کی
ہوا رنگ میں تر جو ہر گل عذار — تو افشاں اڑانے لگے شہریار
یہ چھایا ہے جود و کرم کا سحاب — برستا ہے چاندی کا مینھ جائے آب
جو افشاں سے معمور تھے قمقمے — وہ سب بیضۂ مرغ زریں بنے
گلال اس قدر قمقموں سے اڑا — شفق گوں رخ آسماں ہو گیا
پہر دن رہے تک یہ صحبت رہی — خریداری رنگ عشرت رہی
ہوا حکم اتنے میں ہر ایک کو — بس اب صحبت رنگ موقوف ہو
یہ سنتے ہی فرّاش آنے لگے — وہ فرش شفق گوں اٹھانے لگے
منوں فرش افشاں جو تھی زر تر — لگے چننے فرّاش بایک دگر

ہوا چن کے افشاں غنی اک جہان
غریبوں کے ہاتھ آئی چاندی کی کان[1]

میلے کے دنوں میں قیصر باغ کی سیر کے لیے تو عام اجازت تھی، مگر اس راگ رنگ کی صحبت میں اعزّا، ارباب نشاط اور مصاحبان خاص کے سوا عوام کا گزر نہ تھا.

سرور لکھنوی کا بیان سنہ ۱۲۷۰ ہجری، ۱۱ شوال کی تھی کہ قیصر باغ میں میلا مقرر ہوا۔ گیروی پوشاک کا حکم گھر گھر ہوا، کہ جو رنگین کپڑے پہنے وہ میلے کی

---

[1] مثنوی جلوۂ اختر ص ۶، و ص ۱۴، و ص ۱۵، و ص ۱۶، و ص ۱۷ ان بیتوں کے بیچ بیچ سے بہت بہت سی بیتیں حذف کر دی گئی ہیں۔ ادیب

سیر دیکھنے قیصر باغ میں آئے، جس کے کپڑے سفید ہوں نکالا جائے...
...۔ اتنا سپیندرو شہاب صرف ہوا کہ دوا کو میسّر نہ ہو سکا۔

امیر، فقیر، جوان، پیر ایک رنگ میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا، قیصر باغ یہ
بہار دیکھ کے پھولا نہ سماتا تھا..........تین دن میلا رہا، بڑا جھمیلا
رہا۔ اُس روز حضرت جوگی بنے، رفقائے خاص بھوگی بنے۔ وہ جو بڑے
بانکے ترچھے شہر کے وضع دار تھے، جوگی جی کے چیلے بنے ہوئے اور بڑے
حضار تھے۔[1]

ناہی کا کوروی کا بیان | ایسی تیاری کا قیصر باغ اور اس میں جانِ عالم کا سا پیارا
شہریار، عالی دماغ۔ چنانچہ شوال کے مہینے ۱۲۶۹ھ ہجری میں رہس کا جوگیا
میلا حضرت نے .... مقرر کیا۔ تمام اہل شہر اور چھ چھ کوس
کا آدمی اُسے دیکھنے کو آیا، چھوٹا بڑا، اعلیٰ ادنیٰ، ملازم رعایا، اندر
باہر، دکان دار، اہل پیشہ، امیر و غریب، بھائی بند، عزیز دیگانے،
صاحب اور مصاحب، کُل ارکانِ دولت و اعوانِ مملکت، کھٹیاریاں
اور نٹنیاں، ہیجڑے، زنانے، کہاریاں، رنڈیاں، کتھک، کشمیری
وغیرہ کل تماشائیوں کی یک رنگ شنگرفی پوشاک تھی اور کُل سامان
بھی شنگرفی۔ دہاتی اور شہری رنڈیوں کا جا بجا جھُرمٹ، اور سب
کمروں پر محلات و بیگمات کا جمگھٹ، جگہ جگہ افیمیوں اور خوش طبعوں
کا جلسہ اور کہیں کہیں ہر قسم کے تماشائی یک جا۔ کہیں پر پونڈے چھلتے
اور کہیں حقے اور گزک کے مزے اُڑتے۔ کوئی اپنی دھن میں گاتا اور

---

[1] فسانۂ عبرت ص ۱۰۳

کوئی بیٹھا سرود و ستار بجاتا۔ کہیں پر دائرہ و دف تھا، اور کہیں کُل تماشا چاروں طرف تھا۔

"الحاصل تین روز برابر یہ رنگ رہا اور ہمیشہ دل سے مزہ نہ گیا۔ چوتھے دن حضرت چاند کی صورت جلوۂ حسن و جمال سے شاد و خرّم مثالِ ماہِ شبِ چاردہم رشکِ منزل کے کمرے پر علانیہ اور بے محابا خلق اللہ کے دیکھنے اور دکھانے کے سامنے رونق افزا ہوئے اور تا دیر مصروفِ تماشا رہے۔ برابر حضرت کے سب شاہزادے اور بھائی بند متخلع بالطبع ہمرنگ اور کمرہ بخوراتِ مشکین و عطر نایابِ رنگین کی بُو سے گنجا ہوا، نافۂ مشک ختن جس کے پاسنگ، کٹہرے سے ملے ہوئے کرسی زرنگار پر حضرت جلوہ فرما، چار سو ظلِ اللہ کا سایہ چمکا ہوا۔ اس وقت ایک ہجومِ عام تھا، عجب لطف کا اژدہام تھا۔ ہر کوئی نقشِ تصویر بنا ہوا حضرت کا جمالِ باکمال دیکھ کر سہو جھو (کذا) اور ہر ایک دل بے اختیار یہ چاہے کہ انھیں کو دیکھا کرے۔ بہ مصداق مصرعِ اُستاد باصفا،

"وہ تماشے کو جو نکلا خود تماشا ہو گیا"

بارے ہزاروں پری زادوں و مرد شہری بلکہ ہر قسم کا اچھا آدمی وہاں اُس جا پر تھا، مگر بادشاہ سا یکتا دوسرا نہ دیکھا۔

"پھر اُسی شب کو حضرتِ اصل کی نقل جوگی بن کر پہاڑ میں چھپے۔ جوگنیں ڈھونڈھنے نکلیں۔ مل گئے، تب صدہا توپیں سلامی کی چھوٹیں آتش بازی کی شورشیں رہیں، شادیانے ساون کے بجے، ناچ گانے کے سماں بندھے کہ ماہ پیکر شاہزادہ کامیاب مقصود اپنے ملک میں گھر کو واپس آیا، ماں باپ نے جس کا جشن کیا۔

"الغرض پانچویں روز یہ جلسہ برخاست ہوا اور لطف سال بھر دل میں رہا۔"[1]

راجا جے گوپال شاق کا بیان

"در سنہ ہفتم جلوس اقدس کہ جلسۂ ساون ملقب بہ یوم المبارک، در شہور شہریاری بہ موافقت ماہ ہائے شمسی، در آغاز سال آن از ہماں روز جلسہ یعنی یک روز قبل از ابتدائے ساون مطابق سیزدہم ہر شہرے کہ از ماہ ہلال باشد، در تحریرش بہ کاغذ دفاتر ارنگ ایجاد ریختہ، در عین فصل دل خواہ و شب ماہ تا سہ شبانہ روز میلۂ دل فروز اندرون قیصر باغ مبارک آہنگ عیش و طرب برانگیختہ خود بدولت ہم جامۂ ارغوانی زیب فرمودند حسب الحکم قضا اقتدار جملہ تماشائیان ایں جلسۂ نادرہ کار و شاہزادگان والا تبار و امرائے عالی وقار و ارکین دربار و کارپردازان و اہل کار و مردم فوج ظفر شعار چہ پیادہ چہ سوار و سکنائے شہر بہشت آثار چہ روسائے جلیل المقدار چہ مردم بازار ہمہ ہا یک سر تن بہ لباس گلنار دادہ گوئے سبقت از گلشن بہار ربودند۔ از روش ہائے عبیری صحن گلستان و سقف خیمہ ہائے شفق رنگ عین یک رنگی زمین و آسمان رنگ اظہار بست۔ ....

....

.... ہر کجا کہ نظر نظارہ باز اں شتافت غیر از رنگ گلنار رنگے بہ روئے کار نہ یافت۔ رقص و سرود رقاصان ناہید ادا و مغنیان باربد نفس از غایت سرور افزائی داد دل کشائی ہا دادہ و بہ وادید تکمیل

---

[1] مرقع خسروی، ورق ۲۰۷ ب، ۲۰۸ ب

محفل عشرت افزا دو ترتیب جلسۂ رہس کیفیت بزم اندر از نظر دیدۂ دل ہا
اُفتاد۔

فی الواقعہ ہمچو جلسہ کہ پیش چشم ہا گردیدہ یقین کہ دیدۂ فلک جہاں دیدہ
باوجود عینک دوچشمی مہر وماہ نہ دیدہ باشد دگوش روزگار باوصف دور
لیل ونہار دراستماع قصۂ ہر شہر وشہر یاد گاہے نہ شنیدہ ایں ہم کہ بہ ایام معینہ
تا سہ سال علی الاتصال بہ نظر ہا گذشت، حقا کہ یادگار روزگار گشت ۱؎

ثاقب نے اس میلے کی ابتدا پر دو قطعۂ تاریخ کہے جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

"کرد ایجاد جلسۂ ساون شاہ واجد علی سکندر جاہ
ہمہ پوشیدہ جامۂ گل رنگ گلشن نو شگفتہ پیش نگاہ
داد از یاد جلسۂ اندر یک نظر ہر کہ دید محفل شاہ
بہر تاریخ سال جشن سعید چوں نمودم خیال وقت پگاہ
ہاتف غیب گل فشاں گردید
"باد اورنگ زیب ظل اللہ"

۱۲۶۹ھ

"بہ قیصر باغ چوں سلطان عالم نمودہ میلۂ رنگین ونادر
پے تاریخ ایں فرخندہ جلسہ
ندا آمد "نشاط افزائے خاطر"

۱۲۶۹ھ

ثاقب کے مندرجۂ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہو کہ واجد علی شاہ کے جلوس کے ساتویں

۱؎ زبدۃ الکوائف۔ قلمی

سال ۱۲۶۹ھ میں ساون کا مہینہ شروع ہونے سے ایک دن پہلے ساون کا جلسہ شروع ہوا اور تین دن رات قیصر باغ کے اندر میلا رہا۔ اس میلے میں شریک ہونیوالے لوگ، خواہ وہ کسی طبقے اور حیثیت کے ہوں، سب کے سب سُرخ پوشاک پہنے ہوئے تھے باغ کی روشوں پر سُرخی چھڑکی ہوئی تھی اور سرخ رنگ کے خیمے نصب تھے۔ ناچ گانے کی محفل جمی ہوئی تھی اور رہس کا جلسہ ہو رہا تھا۔ یہ قیصر باغ کا میلا یا ساون کا جلسہ مقررہ تاریخوں میں تین سال تک برابر ہوتا رہا۔

زبدۃ الکوائف کا جو اقتباس اوپر نقل کیا گیا ہے اس کی ابتدائی سطروں کی شرح خود مصنف کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ ساون کا پہلا جلسہ یا قیصر باغ کا پہلا میلا جس دن شروع ہوا تھا اُس دن کا نام واجد علی شاہ نے "یوم المبارک" رکھا تھا، اسی دن سے ایک نیا سنہ قائم کیا تھا، جس کے مہینوں کے نام[1] یہ تھے ماہ واجدی[1]، ماہ محمدی[2]، ماہ اختری[3]، ماہ سکندری[4]، ماہ سلیمانی[5]، ماہ نبی[6]، ماہ امامی[7]، ماہ صنوبر[8]، ماہ مراتب[9]، ماہ منصوری[10]، ماہ حسینی[11]، ماہ اثنا عشری[12]۔ یہ نیا سنہ اور مہینے دفتروں کے کاغذات میں لکھے جاتے تھے۔ چنانچہ مصنف نے اس جلسے اور میلے کی ایجاد کی تاریخ یوں لکھی ہے:

---

[1] سجاد حسین ریحانی نے سوانح شاہ اودھ (ص ۶۴) میں سنہ واجدی کے تقریباً کل مہینوں کے یہی نام بتائے ہیں، صرف دو تین ناموں میں ذرا ذرا سا فرق ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہو۔ مگر ایک غلطی خود مؤلف سے بھی ہوئی ہے۔ انھوں نے ان مہینوں کو سنہ جلوس کے مہینے قرار دیا ہے حالانکہ وہ واجد علی شاہ کے قائم کیے ہوئے ایک نئے سنہ کے مہینوں کے نام ہیں۔ انھوں نے ان مہینوں کی ترتیب بھی بدل دی ہے اور ان کے نام یوں لکھے ہیں، ماہ واجدی، ماہ محمدی، ماہ اختری، ماہ سکندری، ماہ حسینی، ماہ اثنا عشری، ماہ امامی، ماہ صنوبر، ماہ مراتب، ماہ منصوری، ماہ سلیمان، ماہ نبی (ادیب)

"سینز دہم ذی قعدہ سنہ ۱۲۶۹ھ مطابق یکم ماہ واجدی سنہ احد

یوم المبارک موافق سنہ جلوس والا"

اس طرح واضح ہوجاتا ہے کہ اس نئے واجدی سنہ کی ابتدا ۱۳ ذی قعدہ سے ہوتی تھی اس سلسلے میں سجاد حسین رنجانی لکھتے ہیں:-

"تقدیم شہر ذی قعدہ کی وجہ یہ ہے کہ پیدائش بادشاہ کی اسی مہینے میں ہوئی تھی"[1]

صغیر لکھنوی کا بیان

غرض حکم سلطاں سے میلے ہوئے — کئی سال لوگوں کے ریلے ہوئے
یہ تھا حکم ہوں غیرتِ ارغواں — لباسِ تنِ طفل و پیر و جواں
ہزاروں گئے باغ میں مرد و زن — مگر سب کے گل رنگ تھے پیرہن
غرض مرد و زن کا یہی حال تھا — زمیں سرخ تھی، آسماں لال تھا
رہس میں تھے سب زہرہ و مشتری — تنِ حور میں تھا لباسِ پری
شہابی جو تھا جامۂ بادشاہ — مصاحب تھے ہم رنگ ظلّ اللہ
عزیزانِ سلطان جمشید فر
سراپا تھے ہم رنگ مہر سحر"[2]

سحر لکھنوی کا بیان

جمع ہیں رنگیں ادا میلا ہے قیصر باغ میں — ہر روش پر نور کا جلسہ ہے قیصر باغ میں
سامنا سلطان عالم کا ہے قیصر باغ میں — سب کو اپنے رنگ پر کھینچا ہے قیصر باغ میں
گیروا ہر ایک کا جوڑا ہے قیصر باغ میں

---

[1] سوانح شاہِ اودھ ص ۶۴
[2] آئین اختر ص ۱۱۰

سچ اگر پوچھو تو سب ہیں جانِ عالم پر فقیر
بھرتے ہیں الفت کا دم طفل و جوان نا و پیر
جس گرو کے سب ہیں چیلے ہو بڑا روشن ضمیر
مرشدِ کامل ہو فنِ عشق میں ہو بے نظیر
جو ہو اس کے رنگ میں ڈوبا ہو قیصر باغ میں

اے سحر بعد از نماز اپنی دعا ہو صبح و شام
جانِ عالم ہیں حقیقت میں خدا رکھے یہ نام
سیر کرنے کو غریبوں کے دیا ہو حکمِ عام
شعر پڑھتے پھرتے ہیں رنگین بیاں رنگیں کلام
ہر چمن میں ڈھیر پھولوں کا ہو قیصر باغ میں

خوش رہیں سلطانِ عالم یہ چمن پھولے پھلے
ہر برس یہ سیر کریں ہم یہ چمن پھولے پھلے
جمع ہوں یک رنگ باہم یہ چمن پھولے پھلے
کہتی ہیں پریاں بھی جم جم یہ چمن پھولے پھلے
کیا اکھاڑا راجہ اندر کا ہے قیصر باغ میں

کمال الدین حیدر کا بیان	"۱۲ / شہر ذیقعدہ روز پنجشنبہ ۱۲۷۱ھ مطابق جولائی ۱۸۵۵ء میلۂ سلطانی موافقِ دستور انتظامِ سال گزشتہ و پیوستہ

(یعنی ۱۲۶۹ھ و ۱۲۷۰ھ) ہوا۔ ہزارہا اہلِ شہر، بے فکرے، بلا لازم، لباس رنگین فقرا پہنے ہوئے داخل قیصر باغ ہوئے اور جتنا سامان جشن و عیش و جلوس تکلفات تھا، حسب الحکم شاہی ہوا۔ فی الحقیقت ایسی کیفیت خاص قابل دید ہے نہ شنید۔ ۱۴/ تاریخ میلے کا خاتمہ ہوا۔ پہلے دن صحبت حال و قال مشائخ صوفیہ بھی روبروئے بادشاہ ہوئی اور ہر سالک مسالک طریقت اپنے جذب و شوق سے اس مجمع عام میں ایک حال سے دوسرے حال میں ہو گیا[۱]۔"

۱؎ قیصر التواریخ جلد دوم ص۱۸۱ اس کتاب کے ایک قلمی نسخے میں اس عبارت میں کچھ لفظ بدلے ہوئے ہیں مگر ان سے معنی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ ادیب۔

راجا درگا پرشاد مہر کا بیان

"... میلۂ عظیم در آں عمارت (یعنی قیصر باغ) قرار داد و خود بصورت جوگی برآمدہ و لباس شنگرفی در بر کردہ با پری رویان و دل ربایان مشغول بہ عیش و نشاط گشتند و تمامی ارکانِ سلطنت و اعیانِ مملکت و خرد و بزرگ شہر بہ حسب فرمان واجب الاذعان لباس شنگرفی پوشیدہ بہ تماشائے ایں جشن جمشیدی حظے وافر برداشتند۔ تا چند ہفتہ ایں جشن مسرت و ایں میلۂ شنگرف امتداد گرفت و ہر سال بہ ہمیں تصرف آمد۔ باوجود مصارف بے شمار تا چند سال ہمتِ علیا برالفرام ایں میلہ مشغول بود ہر سال از سابق رونقے افزود[۱]۔"

میلا کب شروع ہوا، کے دن رہتا تھا اور کے سال ہوتا رہا

جو بیانات اوپر نقل کیے گئے ہیں وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ جوگیا میلے کی بنیاد ۱۲۶۹ھ میں پڑی۔ لیکن اس بات میں کچھ اختلاف ہے کہ اس کی ابتداء کس مہینے میں اور کس تاریخ کو ہوئی۔ اس ضمن میں جن دنوں، تاریخوں اور مہینوں کا نام لیا گیا ہے وہ یہ ہیں :۔

ساون کے دن، برسات کا موسم، ساون شروع ہونے سے ایک دن پہلے، شوال کا مہینا، ۱۱ر شوال، ۱۱ر شوال روز چہار شنبہ، ۱۳ر ذی قعدہ، یوم المبارک، ہجری اور فصلی سنوں کے مہینوں اور تاریخوں کی تطبیق سے ان دنوں اور تاریخوں میں (۱۳ر ذی قعدہ کو چھوڑ کر) صرف دو تین دن کا فرق نکلتا ہے۔ ۱۳ر ذیقعدہ ان تاریخوں سے کم و بیش ایک مہینے کے بعد پڑتی ہے اور ۱۲۶۹ھ میں اس تاریخ کو ساون کا مہینا ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے یہ تاریخ صحیح نہیں معلوم ہوتی اور یہ بات تقریباً یقینی قرار پاتی ہے کہ یہ میلا پہلی مرتبہ ۱۱ر شوال کو یا اس کے ایک دو دن بعد

۱۔ بوستان اودھ ص ۱۵۴

شروع ہوا تھا۔

کئی ہم عصر مصنف اس بات پر متفق ہیں کہ یہ میلا تین دن رہتا تھا۔ صفر ناآمی نے اس کی مدّت چار دن بتائی ہے اور رتھر سند یلوی نے لکھا ہے کہ وہ کئی ہفتے جاری رہتا تھا۔ ان کا یہ قول تحقیق پر مبنی نہیں ہے۔

کمال الدین حیدر کے قلم سے ۱۲۷۱ھ کے جوگیا میلے کا بیان جو اوپر نقل کیا گیا ہے اس میں فقرہ "میلۂ سلطانی موافقِ دستورِ انتظام سالِ گذشتہ وپیوستہ ہوا" صاف بتاتا ہے کہ یہ میلا ۱۲۶۹ھ میں شروع ہو کر ۱۲۷۱ھ تک تین سال جاری رہا۔ ۱۲۷۲ھ میں ۲۹ جمادی الاوّل کو میلے کے دن آنے سے کوئی پانچ مہینے پہلے واجد علی شاہ معزول کر دیے گئے، اودھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور بہت سے ثقافتی مظاہر کی طرح اس رنگین میلے کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ امیر مینائی اپنے دلی تاثر کا اظہار یوں کرتے ہیں:۔

امیرؔ افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے وہ میلے ہم کو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

جوگیا میلے کی اہمیت

اردو ڈرامے کی تاریخ میں قیصر باغ کے جوگیا میلے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لکھنؤ کے شاہی محل میں رہس کے نام سے جو ڈرامے بڑے ساز و سامان کے ساتھ کھیلے جاتے تھے اُن کو ایک مدّت تک بادشاہ کے خاص عزیزوں، بیگموں اور مصاحبوں کے سوا کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ۱۲۶۷ھ کے اواخر میں بعض شاہی تقریبوں کے موقعہ پر شہر کے مخصوص مدعو عمائد کو بھی انھیں دیکھنے کا موقع ملا۔ جوگیا میلے میں رہس کے یہ پرشان جلسے منظرِ عام پر آ گئے۔ سال میں صرف یہی ایک موقع تھا جب ہر شخص بے روک ٹوک ان جلسوں میں شریک ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں عبدالحلیم شرر کا جزءً صحیح بیان حسبِ ذیل ہے:۔

"سال میں ایک مرتبہ قیصر باغ میں ایک عظیم الشان میلا ہوتا

تھا، جس میں پبلک کو قیصر باغ میں آنے اور جہاں پناہ کی عشرت پرستیوں کا رنگ دیکھنے کا موقعہ مل جاتا تھا۔ بادشاہ نے سری کرشن جی کا رہس

.... دیکھا تھا .... اس

رہس سے ڈرامے کے طور پر ایک کھیل ایجاد کیا تھا، جس میں خود کنھیا بنتے .... کبھی جوشِ جوانی کے جذبات سے جوگی بن جاتے .... میلے کے زمانے میں صحبتوں میں شریک ہونے کی عام اہلِ شہر کو اجازت ہو جاتی، مگر اس شرط کے ساتھ کہ گیروے کپڑے پہن کر آئیں[۱]۔"

"جب قیصر باغ کے میلوں کا دروازہ عوام الناس کے لیے بھی کھل گیا تو سارے شہر کے شوقینوں میں ڈرامے کا فن خود بخود ترقی کرنے لگا[۲]۔"

جس شخص کو رہس کے جلسے میں شرکت کا موقعہ مل گیا وہ اس کا دل دادہ ہو گیا۔ ان جلسوں کی عام پسندی کا ذکر خود واجد علی شاہ نے یوں کیا ہے:

اُٹھاتے ہیں کیا کیا مزے سامعیں ۔۔۔ بھلا ایسے ہوتے ہیں جلسے کہیں
عجب بزم حاصل ہو جس سے سرور ۔۔۔ حقیقت میں آوازہ ہے دور دور
یہ سُن سن کے لذت اُٹھاتے ہیں لوگ ۔۔۔ کہ مشتاق ہو ہو کے آتے ہیں لوگ[۳]"

یہ نئی طرح کا جلسہ سب کو بے حد پسند آیا اور اس کو دیکھنے کا شوق ہر دل میں پیدا ہو گیا۔ بقول واجد علی شاہ:

۱؎ گزشتہ لکھنؤ ص ۵۶ - ۵۷

۲؎ گزشتہ لکھنؤ ص ۸۷

"کیا ساری خلقت نے جلسہ پسند ہوا شوق دل دیکھنے سے دو چند[۱]"

مگر شاہی جلسے میں روز روز شرکت کہاں ممکن تھی! آخر عوام کا شوق پورا کرنے کے لیے لوگوں نے اسی طرز کے جلسے اپنے اپنے طور پر ترتیب دے لیے۔ واجد علی شاہ کہتے ہیں:-

"ہزاروں نے کی پیروی اختیار دیے جلسے اپنی طرح پر قرار
نیا ناچ گانا نئی گفت گو یہی جلسہ اب عام ہے کو بہ کو
یہاں تک کہ اطفال بھی صبح شام یہی کھیل اب کھیلتے ہیں مدام[۲]"

اہلِ لکھنؤ میں ڈراما دیکھنے کا شوق جس شدت سے پیدا ہو گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں ڈرامے لکھے جانے لگے، ان کو کھیلنے کا سامان ہونے لگا اور ایک طرح کا عوامی اسٹیج وجود میں آگیا۔ اس نئے اسٹیج کے لیے جو ڈرامے لکھے گئے، اُن میں سب سے پہلا اور سب سے بہتر وہ ڈراما ہے جو امانت لکھنوی نے اندر سبھا کے نام سے لکھا۔ یہ ڈراما ایک مدت تک دوسرے لکھنے والوں کے لیے نمونے کا کام دیتا رہا۔ نیر لکھنوی لکھتے ہیں۔

"واجد علی شاہ کو جب رہس پسند آیا تو انھوں نے اپنے مذاق اور اپنے خیالی پلاٹ کا ایک نیا رہس تیار کیا۔ اُس کو دیکھتے ہی رعایا میں اس بات کا شوق پیدا ہوا کہ عاشقانہ قصے جو اُن دنوں پریوں کے حسن و عشق سے زیادہ وابستہ تھے، عملی صورت میں دکھائے جائیں۔ پبلک کا یہ رجحان دیکھ کے میاں امانت نے . . . . . . اپنی اندر سبھا تصنیف کی . . . . یہ اندر سبھا جیسے ہی شہر میں دکھائی گئی ہر شخص والہ و شیدا

۱؎ ۲؎ عشق نامۂ منظوم ص ۶۱

ہوگیا۔ یکایک بیسیوں سبھائیں شہر میں قائم ہوگئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا
اس قدر رواج ہوا کہ گوتیوں اور ناچنے والی رنڈیوں کا بازار چند روز کے لیے
سرد پڑ گیا۔ اب امانت کے سوا اور بہت سے لوگوں نے نئی سبھائیں بنانا شروع
کیں ...... اس مذاق نے ڈرامے اور تھیٹر کی مضبوط بنیاد ڈال
دی تھی اور اگر چند روز اور شاہی کا دور رہتا تو اچھے اصول پر خالص ہندستانی
ناٹک ایک خاص صورت پیدا کر لیتا، جو بالکل اچھوتی اور ہندوستانی مذاق
میں ڈوبی ہوتی۔[1]

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہو کہ اردو ڈرامے کا آغاز،
اس کی ابتدائی ترقی، اس کی مقبولیت اور عام رواج کا سہرا واجد علی شاہ کے سر
ہے اور اس کے لیے اردو زبان ہمیشہ ان کی ممنون رہے گی۔

---

[1] گزشتہ لکھنؤ ص ۱۸۵

خلطِ مبحث

اردو ڈرامے کے ابتدائی دور پر لکھنے والے بیشتر خلطِ مبحث کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کسی نے اندر سبھا اور شاہی رہس کو، کسی نے رہس کے ناچ اور رہس کے جلسے کو، کسی نے قیصر باغ کے جوگیا میلے اور واجد علی شاہ کے جوگی بننے کی رسم کو، کسی نے اس رسم اور رہس کو خلط ملط کر کے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس خلطِ مبحث کی سب سے نمایاں مثال شاہی رہس کا وہ بیان ہو جو ولیم نائیٹن[1] نے شاہی محل کی ایک خادمہ الٰہی جان[2] سے سن کر لکھا ہے۔ وہ بیان انگریزی سے اردو میں منتقل کر کے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:۔

الٰہی جان کا بیان | ہر سال جاڑوں کے ایک مہینے میں واجد علی شاہ اپنے گھر والوں میں ایک ڈرامائی کھیل کھیلا کرتے تھے جس میں وہ خود اور دربار کی خواتین شرکت کرتی تھیں۔ اس کھیل میں ایک دیو کا ایک بہت خوبصورت لڑکی غزالہ کو اٹھا لے جانا اور آخر کار راجا اندر کا اسکو واپس دلا دینا دکھایا جاتا تھا

---

[1] William Knighton اودھ میں اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب "الٰہی جان کی کہانی، یا ایک مشرقی ملکہ کی خانگی زندگی" ۱۸۶۵ء میں لکھی۔

[2] نائیٹن نے اس کا نام Elihu Jan لکھا ہے جو "الٰہی جان" کی بگڑی ہوئی صورت

ہر سال بادشاہ کی بیگموں میں سے ایک غزالہ بننے کے لیے منتخب کی جاتی تھی اور دوسری بیگمیں پریوں کی پوشاک پہنتی اور چاندی کے پر لگاتی تھیں۔ ایک بیگم راجا اندر بنتی تھی اور دوسری بیگمیں بڑے جنوں اور اُن کے ملازموں کا بھیس بناتی تھیں۔ ان کے چہرے، پَر اور زیور کالے ہوتے تھے۔

یہ کھیل قیصر باغ کی چاندی والی بارہ دری میں کھیلا جاتا تھا۔ اس کام کے لیے اس کے تین حصّے کر لیے جاتے تھے۔ ایک حصّے میں قیمتی سامان سے راجا اندر کا دربار سجایا جاتا تھا۔ اس کے کھمبوں پر چاندی کے پتر منڈھ دیے جاتے تھے اور چھت اور دیواریں نہایت بیش قیمت چیزوں سے آراستہ کی جاتی تھیں۔ رات کو اُنہوں اور جھاڑوں کی کثرت سے بارہ دری کا وہ حصّہ ایک نور کا بقعہ بن جاتا تھا۔ بیچ میں راجہ اندر کا تخت ہوتا تھا، جس پر وہ بیگم جو راجہ اندر بنتی تھی بڑی شان سے نہایت قیمتی پوشاک پہن کر پریوں کے جھرمٹ میں بیٹھتی تھی۔ بارہ دری کے دوسرے حصّے میں ایک کمرہ شاہی خوابگاہ کی طرح آراستہ کیا جاتا تھا۔ کھیل کے پہلے دن حورِ وش غزالہ ایک قیمتی مسہری پر لیٹی ہوئی دکھائی دیتی تھی، گویا سو رہی ہے۔ بادشاہ (واجد علی شاہ) غزالہ کے شوہر بنتے اور اُس کے پہلو میں لیٹے ہوتے تھے۔ یہ منظر دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ سنہری مسہری، قیمتی چادر، شاندار قالین، طلائی سامان اور نازک اعضا والی حسین غزالہ! وہ زرکار باریک کپڑوں اور کالے بالوں میں چمکتے ہوئے جواہرات سے بے حد پیاری معلوم ہوتی تھی۔ اس کے پہلو میں بادشاہ، دوہرے

اور بھاری جسم کے، شان دار لباس پہنے لیٹے ہوتے تھے۔

آدھے دن تک دونوں سوتے رہے۔ آخر بادشاہ مسہری سے اٹھ کر باہر گئے اور ایک بُرے جن کے ملازم غزالہ کو مسہری سمیت اٹھا لے گئے اور کہیں چھپا دیا۔

جب بادشاہ کو، جو غزالہ کے شوہر بنے ہوئے تھے، اس حادثے کی اطلاع ہوئی تو وہ جوگی بن کر اُس کو ڈھونڈھنے نکلے۔ ننگے بدن صرف ایک تہمد باندھے ہوئے، بدن پر بھبھوت ملے ہوئے، ہاتھ میں ڈنڈا، پہلو میں جھولی، زبان پر ہائے غزالہ ہائے غزالہ، سارے محل میں ڈھونڈھتے پھرے۔ اُن کی بیوی خاص محل ہلکے گیروے رنگ کا ماتمی لباس پہنے ہوئے ساتھ تھیں اور محل کے سب لوگ، جو کھیل میں مصروف نہ تھے، اسی رنگ کے کپڑے دو دن تک پہنے رہے۔

بادشاہ فقیر بنے ہوئے، ہائے غزالہ ہائے غزالہ کہتے ہوئے باغوں میں، محل کے اندرونی راستوں میں، ایک ایک کمرے میں غزالہ کو ڈھونڈھتے پھرے، خاص محل اور دوسری عورتیں بھی ماتمی لباس میں ساتھ رہیں۔ اس تلاش کے دوران میں پورا لکھنؤ ہلکے گیروے رنگ کے کپڑے پہننے پر مجبور تھا۔ شاید یہ حکم جاری ہو گیا تھا کہ جو شخص کسی دوسرے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے دکھائی دے وہ قید کر دیا جائے۔

اس درمیان میں غزالہ بارہ دری میں راجا اندر کے دربار میں پہنچا دی گئی۔ راجا اندر نے اس کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا اور اس کو اپنی پریوں میں شامل کرنا چاہا۔ کھیل کے اس حصے میں زیادہ

مزہ اس وجہ سے آیا کہ ہر شخص واقف تھا کہ راجا اندر، جو غزالہ سے اتنی محبت جتا رہا ہو، وہ مرد ہی نہیں بلکہ مردانے لباس میں ایک عورت ہو۔ مگر یہ بڑا شاندار منظر تھا۔

آخر کار جب جوگی اپنی بے نتیجہ تلاش سے تھک کر نڈھال ہو گیا اور یہ فرض کر لیا گیا کہ وہ ساری دنیا چھان چکا اور ہر قلم رو میں غزالہ کو تلاش کر چکا تو بڑے جنوں کے ملازموں میں سے ایک کو شوہر کی اتنی محبت دیکھ کر رحم آیا۔ وہ اس کے پاس آیا اور بہت سے وعدے لے کر اس کو بتایا کہ کھوئی ہوئی حسینہ کہاں ہے۔ جوگی خوشی کے مارے اچھل پڑا اور اپنے ساتھیوں سمیت اندر کے دربار میں پہونچا۔ وہاں حسین غزالہ اس طرح دکھائی دی کہ وہ مصنوعی اندر کے پہلو میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی ہو اور وہ اس سے محبت آمیز باتیں کر رہا ہو۔ اس موقع پر ایک طولانی گفت گو شروع ہوئی، جس میں آخر کار اندر نے غزالہ کو واپس کرنے کا وعدہ کیا۔ بشرطیکہ اس کا شوہر مختلف طریقوں سے یعنی سپاہی، شکاری، عاشق، مغنّی اور رقّاص کی حیثیت سے اپنی لیاقت کا ثبوت دے۔

کتنا عجیب منظر تھا جب دوسرے دن جوگی ایک سپاہی کی شان سے چمچماتی ہوئی زرہ پہنے ہوئے اپنا جنگی ہنر دکھانے کے لیے نکلا۔ اس نے بڑے جنوں کے کالے ملازموں کو ایک ایک کر کے شکست دی۔ اندر کا سارا دربار تحسین و آفرین کرنے لگا اور سب لوگ چپکے چپکے اس کی آرام گاہ تک ساتھ گئے کہ اس کی خوب صورت زرہ اڑا لیں۔ شکاری، عاشق، مغنّی اور رقّاص کی حیثیت سے بھی وہ اتنا ہی کامیاب رہا

اور اس کو اپنی دلھن، حسین غزالہ واپس مل گئی۔ تمام مجمع خوشیاں منانے لگا اور غزالہ کو اسی شاہی حجرے میں لے گیا جہاں سے وہ گم ہوئی تھی۔ جس منظر سے یہ کھیل شروع ہوا تھا اسی پر تمام ہو گیا۔ یہ کھیل دس دن تک چلتا تھا اور دس دن اور دس رات یہ تماشا جاری رہتا تھا۔[1]

بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ دسویں دن مجمع کی تفریح کے لیے بارہ دری میں ناچتے تھے اور اس جشن کے اختتام پر اپنی والدہ اور خاص محل اور دربار کی ممتاز خواتین سے اصرار کرتے تھے کہ وہ نقدی کی شکل میں تحفے دیں۔ ایک مرتبہ بادشاہ کی والدہ نے تین ہزار روپے دیے جس سے وہ بہت خوش ہوئے۔

دربار کی ایک دوسری تفریح، جس سے بادشاہ کو بہت دلچسپی تھی، ایک طرح کا کھیل تھا جو بادشاہ اور شاہ جن کے درمیان ہوتا تھا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ یہ شاہ جن کون تھا اور کہاں سے آیا تھا، مگر وہ حیرت خیز باتیں کرتا تھا۔ لوگ اس سے اپنی بیماریوں، تکلیفوں اور پریشانیوں کی بابت سوال کرتے تھے اور تعجب خیز جواب پاتے تھے جن سے ان کو بہت تسکین ہو جاتی تھی۔

کئی گانے اور ناچنے والیوں نے پریوں کا بھیس بنایا اور کھیل کے وقت اپنے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُس کے تخت کو

---

[1] اصل کتاب میں یہ جملہ مقام سے بہت پہلے واقع ہوا ہے۔ بیان کی ترتیب اور تسلسل کے خیال سے وہ یہاں منتقل کر دیا گیا ہے۔ ادیب

گھیر لیا۔ بادشاہ نے اپنا پارٹ بڑی شان کے ساتھ ادا کیا۔ جب سب لوگ بادشاہ اور اس کے تخت کو دیکھ چکے، تو دروازہ بند کر دیا گیا۔ پریاں اس کے ساتھ اندر رہیں اور سب لوگ باہر کر دیے گئے۔ اسوقت واجد علی شاہ شاہی لباس میں اپنے خلوت خانہ سے برآمد ہوئے اور ان کے خادموں نے دروازہ کھٹکھٹایا، جو کچھ گفت گو کے بعد کھل گیا۔ مگر شاہ جن مع تخت غائب! اور سب سامان اسی طرح موجود!! کوئی دوسرا دروازہ نہ تھا جدھر سے وہ نکل جاتا ایک ہی دروازہ اور سب لوگ اس کے پاس جمع۔ ادھر سے نکلتا تو سب اس کو دیکھ ضرور لیتے۔ کھڑکیاں بہت اونچی تھیں اور اتنی چھوٹی کہ کوئی آدمی اُن میں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ فرش پختہ تھا اور اس میں کوئی سوراخ بھی نہ تھا۔

اب واجد علی شاہ اندر گئے۔ ایک قیمتی قالین اور مسند بچھا کر گاؤ تکیہ لگا دیا گیا اور بادشاہ اُس مسند پر رونق افروز ہوئے۔ اتنے میں ہوا سے ایک آواز آئی، سلام علیکم، اور بادشاہ نے سلام کا جواب دیا۔ یہ شاہ جن تھا جس نے سلام کیا۔ مگر وہ نگاہوں سے اوجھل تھا اور اُس کی آواز اوپر سے آتی ہوئی معلوم ہوئی تھی۔ یہ سلام اُن پریوں میں سے کسی نے نہیں کیا تھا جو چاروں طرف کھڑی ہوئی تھیں۔ یہ ایک مرد کی آواز تھی، اسی مرد کی جس کو سب نے تخت پر بیٹھے دیکھا تھا۔ اور اب وہ مرد اور تخت دونوں غائب تھے!

اب پریاں واجد علی شاہ کے سامنے گانے ناچنے لگیں جب خوب ناچ گا چکیں تو بادشاہ اور شاہ جن میں پھر باتیں ہوئیں اور

شاہ جن نے وعدہ کر لیا کہ وہ نیچے اتر کر اپنے بھائی یعنی واجد علی شاہ کے پاس بیٹھ کر باتیں کرے گا۔

دروازہ پھر بند کر دیا گیا۔ بسم اللہ کی آواز آئی۔ اب جو سب لوگ اندر گئے تو دیکھا کہ شاہ جن اپنے تخت پر بیٹھا واجد علی شاہ سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ ہوا میں غائب ہو گیا تھا وہیں سے آ گیا ہوگا۔ سیکڑوں آدمیوں نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

اب سب لوگ گانے بجانے، ناچنے لگے، بادشاہ بھی اس میں شریک ہو گئے اور شاہ جن نے تحسین و آفرین کی صدا بلند کی۔ اس طرح یہ کھیل ختم ہوا[1]

غلط مبحث کے اسباب | اس بیان پر غور کرنے سے صاف نظر آئے گا کہ اس میں واجد علی شاہ کے جوگی بننے کی رسم، قیصر باغ کا جوگیا میلا، غزالہ ماہ رو کا قصہ جو ناٹک کی طرح کھیلا جاتا تھا اور واجد علی شاہ کی ایک مصنوعی شاہ جن سے ملاقات، یہ سب چیزیں مخلوط ہو گئی ہیں۔ اس خلط مبحث کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ باتیں الٰہی جان کو غلط یاد رہیں، کچھ اس نے غلط بیان کیں اور کچھ نائٹن صاحب نے غلط سمجھیں۔ یہ تسلیم کرنا بھی مشکل ہو کہ الٰہی جان کا یہ بیان تمام تر ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے۔ واجد علی شاہ کے یہاں جو ناچ گانے کی محفلیں اور کھیل تماشے کے جلسے ہوتے رہتے تھے۔ ان میں صرف مخصوص طور پر مدعو کیے ہوئے لوگ شریک ہو سکتے تھے، ہر کس و ناکس کی رسائی نہ تھی۔ الٰہی جان ایک جاہل عورت اور ادنیٰ درجے کی خادمہ تھی اور واجد علی شاہ کے محل میں رہتی بھی نہ تھی بلکہ ان کی والدہ کے پاس حقہ بھرنے

---

[1] ایک مشرقی ملکہ کی خانگی زندگی (بزبان انگریزی) چودھواں باب

کی خدمت پر نوکر تھی۔ اُس نے کئی جگہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اُس کی مالکہ کو یہ ناچ رنگ کے جلسے ناپسند تھے اور وہ ان میں شرکت نہیں کرتی تھیں۔ ان حالات میں یہ قرین قیاس نہیں ہو کہ وہ خود ان جلسوں میں شریک ہوا کرتی ہو۔ وہ ان کا ذکر سنا کرتی ہوگی اور یہ سنی سنائی باتیں دس بارہ برس کے بعد جس قدر اُسے یاد رہ گئیں وہ اُس نے مسٹر نائیٹن سے بیان کر دی ہوں گی۔ انھوں نے ان منتشر اور متفرق باتوں میں ربط پیدا کر کے اُن کو ایک مسلسل بیان کی صورت میں پیش کر دیا ہو۔

کلکتے میں شاہی رہس

شاہی کا خاتمہ رہس کا عملہ برطرف

جب تک واجد علی شاہ کی سلطنت باقی رہی، رہس کے جلسے ہوتے رہے۔ جب ۲۹ جمادی الاول ۱۲۷۲ھ (۷ فروری ۱۸۵۶ء) کو وہ برائے نام بادشاہی سے بھی محروم کر دیے گئے تو شاہی رہس کا بھی خاتمہ ہو گیا اب اودھ میں انگریزوں کا انتظام شروع ہوا۔ واجد علی شاہ نے تمام شاہی ملازموں کو برخاست کر دیا۔ رہس کا عملہ بھی برطرف کر دیا گیا اور رہس والیاں روتی رُلاتی ہوئی رخصت ہو گئیں:۔

"رہس برطرف شاہ نے جب کیے | تو بدخواہ، غم خوار سب رو دیے
دو خانہ پہ جب لگیں ڈولیاں | چلیں لولیاں مثل اشک رواں
جہاں وہ خوش الحانی ساز تھی | وہاں آہ و زاری کی آواز تھی
جہاں سب بجاتے تھے ہر دم شاد | بندھے تھے اسی گھر یہاں شکوں کے تار
جو گاتی تھیں جھولوں پہ اکثر ملار | وہی صورت ابر تھیں اشک بار[۱]

کلکتے میں قیام المناک حادثے

۵ رجب ۱۲۷۲ھ (۱۲ مارچ ۱۸۵۶ء) کو واجد علی شاہ لکھنؤ کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر کلکتے کو روانہ ہوئے اور دو مہینے بعد ۷ رمضان ۱۲۷۲ھ (۱۳ مئی ۱۸۵۶ء) کو مٹیا برج، کلکتے پہونچے۔ واجد علی شاہ لندن

۱۔ آئین اختر ص ۱۰۲-۱۰۵

جاکر برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن حالات سے مجبور ہوکر خود کلکتے میں ٹھہر گئے اور اپنی والدۂ محترمہ جناب عالیہ ملکہ کشور، صاحب بھائی مرزا اسکندر حشمت اور ولی عہد کیواں قدر مرزا محمد حامد علی کو مولوی محمد مسیح الدین خاں کاکوروی، سفیر شاہی کے ہمراہ لندن بھیجا۔ یہ قافلہ ۱۴ر شوال ۱۲۷۲ھ (۱۸ر جون ۱۸۵۶ء) کو روانہ ہوا۔ واپسی میں پیرس پہونچ کر ۲۶ر جمادی الثانی ۱۲۷۳ھ (۲۱ر فروری ۱۸۵۸ء) کو ملکۂ کشور نے اور ۱۱ر رجب ۱۲۷۳ھ (۸ر مارچ ۱۸۵۸ء) کو مرزا اسکندر حشمت نے انتقال کیا۔ عالم غربت میں ماں اور بھائی کی پے درپے موتیں واجد علی شاہ کے لیے بڑے الم ناک سانحے تھے۔

دل کے یہ زخم ابھی آئے ہی تھے کہ لکھنؤ میں غدر کے آثار پیدا ہوگئے اور انگریزوں نے واجد علی شاہ کو کلکتے کے قلعے فورٹ ولیم میں نظر بند کر دیا۔ وہاں انھوں نے چھبیس مہینے جس تکلیف سے بسر کیے اس کی یاد اُن کے دل سے کبھی نہ گئی۔ آخر کار جب غدر کا ہنگامہ فرو ہوگیا اور اودھ میں انگریزوں کا بخوبی تسلط ہوگیا تو ۸ر ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ (۹ر جولائی ۱۸۵۹ء) کو واجد علی شاہ قید فرنگ سے رہا ہوکر مٹیا برج کلکتے واپس آئے۔ ۲۷ر صفر ۱۲۷۶ھ (۲۶ر ستمبر ۱۸۵۹ء) کو ولی عہد بھی انگلستان سے بے نیل و مرام واپس آگئے۔ اُن کے آنے سے واجد علی شاہ کو ماں اور بھائی کا غم تازہ ہوگیا۔ اب اُن کو اودھ کا تخت و تاج واپس ملنے کی کوئی اُمید نہ رہی اور اپنی موجودہ زندگی پر قناعت کرلینے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا۔

رہس کے نئے جلسے کی تیاری | کچھ دن گزرنے کے بعد غم غلط کرنے کے لیے پھر رہس کا جلسہ جمانے کی فکر ہوئی اور رہس میں کام کرنے والے لکھنؤ سے بلائے گئے۔ صفیر

کہتے ہیں:۔

"مثا کشور رنج سے عہد جب فساد | ولی عہد تنہا پھرے نا مراد
کہا آکے سب حال ماں باپ سے | ملے بعد سہ سال ماں باپ سے
سنائی سنی شاہ نے غم کیا | الم بھائی کا ، ماں کا ماتم کیا
غم داغ سے جب فراغت ہوئی | دل افروز پھر بزم عشرت ہوئی
رہس کا جو پھر شہ کو آیا خیال | وطن سے طلب ہو گئے ذی کمال
سخاوت میں یوں دست ڈالا رہا | کہ حاتم سے بھی بول بالا رہا"[1]

ہم کو معلوم ہو چکا ہو کہ واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں رہس کا پہلا جلسہ جو تیار کیا تھا اس میں ایک چھوٹا سا راگ ناچ ناٹک کھیلا جاتا تھا جو کنھیا اور رادھا کی داستان محبت پر مبنی تھا اور قدیم اصطلاح کے مطابق اُس کو رہس کہنا چاہیے تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد انھوں نے اپنی تین مثنویوں کے جو ناٹک یا ڈرامے تیار کیے وہ بھی رہس کہلائے۔ یہ لفظ "رہس" کے معنوں میں توسیع تھی۔ اس توسیعی معنی والے رہس کے لیے اتنا کثیر خرچ اور اتنا اور ایسا سامان درکار تھا جو ایک حکمراں بادشاہ ہی مہیا کر سکتا تھا۔ اس لیے اب معزول بادشاہ نے اصلی معنی والے رہس یعنی کنھیا اور رادھا کے ناٹک کی تیاری شروع کی۔ اس کم خرچ رہس پر بھی کثیر رقم صرف ہوتی تھی، جس کی کچھ تفصیل آئندہ صفحوں میں درج کی جائے گی۔

یہ جلسہ کب تیار ہوا | اوپر لکھا جا چکا ہو کہ ولی عہد کی واپسی ۲۷ صفر ۱۲۷۴ھ کو ہوئی تھی۔ شاہی کے زمانے میں لکھنؤ میں یکم محرم سے ۸ ربیع الاول تک شہدائے کربلا

---

[1] آئینِ اختر ص ۲۴۵

کی عزاداری کا زمانہ رہتا ہے۔ مٹیا برج، کلکتے میں بھی اسی دستور پر عمل درآمد تھا اس لیے رہس کی تیاری ۱۲۷۶ھ میں ۸ ربیع الاوّل کے بعد شروع کی گئی ہوگی پرانے اداکاروں اور استادوں کو لکھنؤ سے بلانا، نئے اداکاروں اور استادوں کو تلاش کرکے نوکر رکھنا، پرانے اداکاروں کی مشق کو تازہ کرنا، نئے اداکاروں کو تعلیم دینا، رہس کی پوشاکیں اور دوسرے سازوسامان تیار کرنا، ان سب کاموں میں کوئی دو سال کا وقت ضرور لگا ہوگا۔ ہر سال پہلی محرّم سے آٹھویں ربیع الاوّل تک عزاداری کے زمانے میں ناچ گانا بالکل بند رہتا تھا اس لیے ممکن ہے کہ رہس کی تیاری میں دو سال سے بھی زیادہ وقت صرف ہوگیا ہو۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کلکتے میں شاہی رہس کا پہلا جلسہ ۱۲۷۸ھ یا ۱۲۷۹ھ میں تیار ہوا۔ واجد علی شاہ نے اپنی کتاب بنی میں لکھا ہے کہ انھوں نے کلکتے میں رہس کا پہلا جلسہ جو تیار کیا وہ رادھا منزل والیاں، کے نام سے موسوم ہے۔ اسی جلسے کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ "اس رہس کو ... تیرھواں چودھواں برس شروع ہے[1]" بنی کی تصنیف کا سال ۱۲۹۲ھ ہے اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کلکتے میں پہلی رہس منڈلی ۱۲۹۲ھ سے تیرہ چودہ سال پہلے یعنی ۱۲۷۸ھ یا ۱۲۷۹ھ میں قائم کی گئی۔

جلسے والیاں اور اُن کی تنخواہیں

اس پہلے جلسہ کے تقریباً سات سال بعد کچھ کچھ وقفے سے چار جلسے یعنی رہس منڈلیاں اور قائم کی گئیں۔ واجد علی شاہ ۱۲۹۲ھ میں لکھتے ہیں کہ ان جلسوں کو قائم کیے ہوئے چھ سات برس ہو چکے ہیں[2]۔ کل جلسے جو واجد علی شاہ نے کلکتے میں ۱۲۹۲ھ تک قائم کیے، اُن کی تعداد تیئس تھی۔ ذیل میں اُن کے نام، ان میں کام کرنے والیوں کی تعداد اور اُن کی تنخواہیں ایک

۱؎ بنی ص ۲۱۰   ۲؎ بنی ص ۳۱۱، ۳۱۲ - ۳۱۶

نقشے کی صورت میں درج کی جاتی ہیں:-

شمار	جلسے کا نام	کام کرنیوالیوں کی تعداد	ماہ وار تنخواہیں
۱	اودھا منزل والیاں	۱۸	ما للعہ + ۱ = ۰ ـــ ۰ ـــ ۱۹۳ ما ہے ۸ ۱۷ = ۰ ـــ ۰ ـــ ۱۷۵۱ میزان ـــ ۰ ـــ ۱۹۴۴
۲	ساروا منزل والیاں	۱۵	ما عہ ۸ + ۱ = ۰ ـــ ۸ ـــ ۱۸۷ ما للعہ + ۱۴ = ۰ ـــ ۰ ـــ ۴۷۲ میزان ۰ ـــ ۸ ـــ ۶۵۹
۳	سلطان خانے والیاں (بڑا جلسہ)	۲۴	ما عہ + ۱۵ = ۰ ـــ ۰ ـــ ۲۲۰ ما عہ + ۱ = ۰ ـــ ۰ ـــ ۱۷۲ ما لعہ ۸ + ۱ = ۰ ـــ ۸ ـــ ۱۲۹ ما ہے + ۱ = ۰ ـــ ۰ ـــ ۱۰۳ علہ + ۲۰ = ۰ ـــ ۰ ـــ ۱۴۴۰ میزان = ۰ ـــ ۸ ـــ ۲۲۶۴
۴	حضور والیاں یا خاص منزل والیاں	۱۱	صہ للعہ + ۹ = ۰ ـــ ۰ ـــ ۴۰۵ عہ + ۲ = ۰ ـــ ۰ ـــ ۴۰ میزان = ۰ ـــ ۰ ـــ ۴۴۵
۵	سرور منزل والیاں (صاحبات خلوت)	۱۲	عہ + ۱۲ = ۰ ـــ ۰ ـــ ۳۲۰

ماہوار تنخواہیں	کام کرنے والیوں کی تعداد	جلسے کا نام	شمار
۱۲ : ۰ ـــ ۰ ـــ ۵۰ : ۰ ـــ ۰ ـــ ۱۳۵ ۳ : ۰ ـــ ۰ ـــ ۱۱۷ ۱ : ۰ ـــ ۰ ـــ ۳۸ میزان : ۰ ـــ ۰ ـــ ۳۴۰	۸	شہنشاہ منزل والیاں	۶
۷ : ۰ ـــ ۰ ـــ ۲۸۰	۷	چھوٹے جلسے والیاں	۷
۱ : ۰ ـــ ۰ ـــ ۷۵ ۴ : ۰ ـــ ۰ ـــ ۲۰۰ میزان : ۰ ـــ ۰ ـــ ۲۷۵	۵	نور منزل والیاں	۸
۲ : ۰ ـــ ۰ ـــ ۱۶۲ ۹ : ۰ ـــ ۰ ـــ ۱۸۰ میزان : ۰ ـــ ۰ ـــ ۳۴۲	۱۱	جواہر منزل والیاں	۹
۷ : ۰ ـــ ۰ ـــ ۴۹۰	۷	خاص جلسے والیاں	۱۰
۱ : ۰ ـــ ۰ ـــ ۷۶ ۶ : ۰ ـــ ۰ ـــ ۱۲۰ میزان : ۰ ـــ ۰ ـــ ۱۹۶	۷	گھونگھٹ والیاں	۱۱
۱ : ۰ ـــ ۰ ـــ ۷۶	۷	نخفہ والیاں	۱۲

شمار	جلسے کا نام	کام کرنیوالیوں کی تعداد	ماہ وار تنخواہیں
۱۳	گاتی والیاں	۷	عسہ ۲۴ : ۰ــ۰ــ ۱۲۰ میزان : ۰ــ۰ــ ۱۹۶ ععہ ۱۴/ : ۰ــ۰ــ ۷۶ عسہ ۶۴ : ۰ــ۰ــ ۱۲۰ میزان : ۰ــ۰ــ ۱۹۶ میزان کل : ۰ــ۰ــ ۸۱۳۸
۱۴	ٹکن والیاں	۷	نامعلوم
۱۵	جھومر والیاں	۷	〃
۱۶	جھلنی والیاں	۷	〃
۱۷	بسیر والیاں	۷	〃
۱۸	بندیا والیاں	۷	〃
۱۹	مرثیے والیاں	۷	〃
۲۰	نقل والیاں	۷	〃
۲۱	تماشے والیاں	۷	〃
۲۲	مصاحبین	۷	〃
۲۳	متفرقات	۱۰	〃

ان فن کار عورتوں کی مجموعی تعداد ۲۱۶ تھی۔ اُن کی تنخواہ کی مجموعی رقم

واجد علی شاہ نے ۸۵۹۸ روپے ماہوار بتائی ہو۔ مگر اس رقم میں ایک ہزار کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ واجد علی شاہ نے آخری دس جلسوں میں کام کرنے والی بہتّر عورتوں کی تنخواہ نہیں لکھی ہو، مگر مندرجہ بالا نقشہ بتاتا ہو کہ کسی جلسے میں کسی عورت کی تنخواہ بیس روپے ماہوار سے کم نہ تھی۔ اگر ان بہتّر عورتوں کی تنخواہ بیس روپے ماہوار قرار دی جائے تو کل ۲۱۶ عورتوں کی مجموعی تنخواہ ۹۵۹۸ روپے ماہوار ہوتی ہے۔

استاد، سازندے وغیرہ ان عورتوں کے علاوہ ناچ گانا سکھانے والے استادوں سازندوں وغیرہ کی تعداد حسب ذیل تھی:-

مغنّی	۱۵	سارنگیے	۴۷
رقّاص	۶	منجیرے والے	۲۲
طبلچی	۲۳	پکھاوجی	۲
ڈھولک والے	۲	سرنگھار والا	۱
گھنٹے والا	۱	بانسری والا	۱
نقارچی	۱۹	ڈومنیاں	۶
شعبدہ باز	۱		

یہ کل ۱۴۵ نفر ہوئے، جن کی مجموعی تنخواہ ۳۲۲۶۱ روپے ماہوار تھی[1]۔

ان فن کاروں میں سے بعض کے نام واجد علی شاہ نے جگہ جگہ لکھ دیے ہیں، ہم یہاں اُن سب کے نام ایک جگہ جمع کیے دیتے ہیں:-

---

[1] بنی ص ۳۳۲

مغنّی یعنی گوّیے :-

غلام حسین خاں۔ پیر خاں۔ علی بخش خاں۔ تاج خاں۔ عنایت خاں۔ فضل امام۔ حیدر خاں۔ احمد خاں۔ عنایت حسین خاں۔

رقّاص یعنی ناچنے والے :-

قائم خاں۔ قلندر بخش۔ حیدر علی۔ محمد حسین۔ بشن۔ غلام عباس۔

سازندے :

خواجہ بخش طبلچی۔ نثار علی خاں پکھاوجی۔ غلام محمد قانون نواز۔

یاد رکھنا چاہیے کہ رہس کے جلسوں سے جو مغنّی اور رقاص متعلق ہوتے تھے وہ رہس والیوں کو ناچ گانے کی صرف تعلیم دیتے تھے۔ خود رہس میں ناچتے گاتے نہیں تھے۔

جلسوں، جلسے والیوں، اُستادوں، سازندوں وغیرہ کی یہ فہرست واجد علی شاہ کی کتاب بنی سے لی گئی ہے[1] جو ۱۲۹۲ھ کی تصنیف ہے۔ اس کے بعد واجد علی شاہ بارہ برس زندہ رہے۔ اُن کے اس زمانے کے ثقافتی کارناموں کا ہمیں کچھ علم نہیں

جلسوں کے مخصوص کام | واجد علی شاہ کے تیئیس جلسوں کی فہرست جو ہم اوپر لکھ آئے ہیں

ان میں سے پہلے پانچ بنے رہس کے لیے مخصوص تھے۔ ان جلسوں میں جو جو پارٹ جن جن عورتوں سے متعلق تھے اُن کی تفصیل بھی واجد علی شاہ نے لکھ دی ہے۔[2]

ان کے بعد کے پانچ جلسوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :-

چھٹا جلسہ۔ "ان کو رہس کی تعلیم نہیں دلوائی ... ... فقط ناچنا

---

[1] بنی ص ۳۰۸-۳۳۲ [2] بنی ص ۳۰۹-۳۱۷

گانا ان کا کام ہو۔"

ساتواں جلسہ :۔ "ان سے بھی رہس متعلق نہیں۔ فقط ناچنا گانا ان کا

کام ہے"۔

آٹھواں جلسہ :۔ "رہس کا کام ان سے متعلق نہیں"۔

نواں جلسہ :۔ "ان سنہ میں، جو بارہ سو بانوے ہجری ہیں، یہ جلسہ

فقط رہس آموزی پر معین ہو کر حوالۂ مہتاب الدولہ بہادر

درخشاں شاعر او خواجہ بخش طبلہ نواز ۔ ۔ ۔ ۔ ہوا"۔

دسواں جلسہ :۔ "ان سے ابھی تک رہس کا کام نہیں لیا۔ وہ کام اب

ان کے آگے پانی سے پتلا نظر آئے گا"۔

اس سے معلوم ہوتا ہو کہ رہس کے کام کے لیے پانچ جلسے تیار ہو چکے تھے اور دو تیار کیے جا رہے تھے۔

گیارہویں سے اٹھارہیں تک آٹھ جلسوں کے لیے کچھ نہیں کہا گیا ہو۔ غالباً ان کا کام صرف ناچنا گانا تھا۔ چار جلسوں کے نام ہیں مرثیے والیاں ، نقل والیاں ، تماشے والیاں اور مصاحبین۔ یہ نام ہی بتاتے ہیں کہ ان کے کام کیا تھے۔ آخری جلسے کا نہ نام رکھا گیا ہو اور نہ کام بتایا گیا ہو۔ لیکن اس میں جو عورتیں شامل تھیں ان میں سے بعض کے خطاب اُن کے کاموں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً آب سال بیگم اور آب دار بیگم کا کام پانی پلانا اور آب دار خانے کا انتظام کرنا، صاف دل بیگم اور مصفا خصال بیگم کا کام مکان اور فرنیچر کو صاف رکھنا، تجلی بیگم کا کام روشنی کا انتظام کرنا، آئینہ جمال بیگم کا کام آئینوں کو صاف کرنا ہوگا۔ یہ سب عورتیں بھی غالباً ناچنا گانا جانتی تھیں۔ اس لیے اُن کا بھی ایک جلسہ قرار دیدیا گیا

مگر چوں کہ مختلف طرح کے کام اُن کے سپرد تھے، اس لیے اس جلسے کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکا۔

جلسے والیوں کی تعلیم | ان جلسوں میں سے بعض کی تعلیم مغنیوں اور رقاصوں کے سپرد تھی، بعض کی تعلیم میں واجد علی شاہ خود بھی اُن کے ساتھ شریک تھے اور بعض کو وہ اکیلے تعلیم دیتے تھے۔ دسویں جلسے (خاص جلسے والیاں) کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"تیسرا سال منقضی ہوتا ہو کہ یخف خود ان کی تعلیم دہی میں بدل و جان مصروف رہتا ہو۔ اب ...... لے سُر میں بہ خوبی واقفیت ہوتی جاتی ہو، نچانا، گوانا، ادتھ بھاؤ بتانا، ٹکڑے پائوں سے لوانا، گیتن بجوانا، سب مجھ سے متعلق ہو۔ کسی سازندے، نوازندے، مغنی، رقاص کو ذرہ دخل نہیں"[1]

واجد علی شاہ کی تعلیم سے وہ کیا کیا سیکھ گئیں۔ یہ خود واجد علی شاہ کی زبان سے سنئے:۔

"چیکوں پر دھرپد، چترنگ، تروٹ، ترانہ، دھمال، رویگ، تیورا، چوتالہ، دھما، تتالہ، کبیر کی چھب، برم، پچھمی، سول فاختہ، چھپ تالہ، چاچر، غزل، ادھال، خیال، ٹھمری، گا لیتیاں ہیں۔ طنبورے پر کام کرتیاں ہیں، بغیر طنبورہ بھی، گلوں کے سُروں پر بھی گا سکیاں ہیں، جواہر چھے کے چھیڑوں ٹکڑے پائوں سے نکالتیاں ہیں۔ دو تین سو چیزیں سب طرح کی آج تک بتا چکا ہوں اور بتلائے چلا جاتا ہوں"[2]

---

[1] بنی ص ۳۲۱-۳۲۲

[2] بنی ص ۳۲۲

تیسرے جلسے (سلطان خانے والیاں) کے تعلیم دینے والوں میں واجد علی شاہ نے اپنے علاوہ مغنی، رقاص اور پکھاوجی کے ساتھ "تعیش الدولہ بہادر عیش شاعر اور خلاصۃ الدولہ بہادر منشی[1] کا نام بھی لکھا ہو اور نواں جلسہ (جواہر منزل والیاں) جن لوگوں کے حوالے کیا گیا تھا ان میں "مہتاب الدولہ بہادر درخشاں شاعر[2]" بھی تھے۔ غالباً رہس کی عورتوں کو گانے ناچنے کے علاوہ پڑھنے لکھنے کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ یاد ہوگا کہ واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں جب عورتوں کی رقص و موسیقی کی تعلیم کے لیے پری خانہ قائم کیا تھا تو اُن کی نوشت و خواند کی تعلیم کا بھی انتظام کیا تھا۔

کل جلسوں میں کام کرنے والیوں کے نام یا خطاب اور اُن کی تنخواہیں وغیرہ بتانے کے بعد واجد علی شاہ لکھتے ہیں:-

"جاننا چاہیے کہ زیر تعلیم راقم تا تحریر ہذا تینتالیس اسم ہیں اور سب جلسے ملا کر دو سو سولہ گانے ناچنے والی .... راقم کے پاس ہر وقت .... موجود ہیں۔ مگر ملاقات اور صحبت اور ہر حکایات ہر لرزش انھیں سے ہوتی ہو جو تینتالیس اسم زیر تعلیم حقیر ہیں[3]"

جلسوں کے مصارف | فن کاروں اور اداکاروں کی تنخواہوں کی تفصیل جو ہم اوپر لکھ آئے ہیں، اُس سے معلوم ہوتا ہو کہ اودھ کے تخت سے محروم ہونے کے بعد کلکتے کے قیام میں واجد علی شاہ اپنی محدود پنشن میں سے موسیقی، رقص اور ناٹک پر صرف تنخواہ کی مد میں (۳۲۶۱ + ۹۵۹۸) ۱۲۸۵۹ روپے ماہوار خرچ کرتے تھے۔ رہس کے سازوسامان پر جو صرفہ ہوتا تھا وہ اس کے علاوہ تھا۔ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:-

---

لہ بنی صد ۳۱۲ ۔ سہ۲ بنی صد ۳۳۱ ۔ سہ۳ بنی صد ۳۳۱

"سرکار راقم سے رہس کے وقت بھاری پیشواز یں مسالے دار مع ڈوپٹا پُر زر اور گھنٹا تحفہ فی اسم علحدہ لا کرتے ہیں اور بعد رقص پھر توشک خانے میں احتیاط سے صندوقوں میں بند کر دیے جاتے ہیں۔ اور رادھا کنھیا، پریوں، صحرا، غربت، عفریت، مسافر، رام چیرا ان سب کا بھی اسباب مع پنہاروں اور راکھن والیوں کے میری طرف عائد اور میرے حسابات میں مشمول ہو۔ اُن کی تنخواہوں سے کچھ علاقہ نہیں[1]"

اتنا کچھ خرچ کرنے کے باوجود واجد علی شاہ لکھتے ہیں:

"مقدرات علی اور زیور میں راقم سے اس قدر رتھیا نہ ہو سکا جو تکمیل کرتا۔ زمان سلطنت اور استقلال میں سب کچھ خدا نے عطا کیا تھا[2]"

رہس منزل | لکھنؤ کی رہس منزلوں کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ مٹیا برج، کلکتہ میں بھی واجد علی شاہ نے ۱۲۹۴ھ میں رہس منزل تعمیر کی تھی۔ اس سنہ میں واجد علی شاہ نے کئی عمارتیں، چشمے، باغ وغیرہ تیار کروائے تھے، جن کے نام اور سال تعمیر مہتاب الدولہ درخشاں نے دو دو شعر کے ستر قطعات تاریخ میں نظم کر دیے ہیں[3]۔ ان میں سے ایک قطعہ یہ ہے۔

رہس منزل ہو پریوں کا اکھاڑا　　عجب کمرہ سلیمانی بنا ہے
درخشاں جلوہ گر ہے سال تاریخ　　مکان جشن خاقانی بنا ہے[4]

'کمرے' سے یہاں ہال مراد ہے۔

ایک دوسرا قطعہ بتاتا ہے کہ اسی سال رقص منزل بھی تعمیر کی گئی تھی۔

---

[1] بنی صفحہ ۳۱　[2] بنی صفحہ ۱۲۳-۱۲۴　[3] درخشاں کے یہ قطعات تاریخ واجد علی شاہ کی کتاب "بنی" کے آخر میں درج کر دیے گئے ہیں۔　[4] بنی ۲۸۳ قطعہ ۶۴

ہے قابل دید رقص منزل ظاہر بہجت کدہ یہی ہے
نغمہ زن سال ہے درخشاں "نادر عشرت کدہ یہی ہے"[1]

خاتمۂ کلام | واجد علی شاہ اپنے زمانے میں ہندستانی موسیقی، رقص اور ناٹک کے سب سے بڑے سرپرست تھے۔ انھوں نے ان فنون کو ترقی دینے کے لیے اپنے محدود ذرائع کے اندر وہ سب کام کیے جن کے لیے ہمارے زمانے میں اتر پردیش کی حکومت نے لکھنؤ میں ہندوستانی موسیقی کا کالج اور ہندوستان کی مرکزی حکومت نے دہلی میں سنگیت ناٹک اکاڈیمی قائم کی ہے۔

---

[1] بنی صفحہ ۳۷۶ قطعہ ۱۶

ضمیمہ

اردو کا پہلا ڈرامہ

"رادھا کنھیا کا قصہ"

مصنفہ

سلطان عالم واجد علی شاہ اختر

مرتبہ

سید مسعود حسن رضوی ادیب

پیش نامہ

یہ ڈراما "رادھا کنھیا کا قصہ" کے نام سے واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں ۱۲۵۸ھ اور ۱۲۵۹ھ کے درمیان میں لکھا تھا اور بعد کو اپنی کتاب بنی میں شامل کر دیا جو ۱۲۹۲ھ کی تصنیف ہے۔ پورا ڈراما ایک مسلسل بیان کی صورت میں لکھا گیا ہے اور اس کے بیچ بیچ میں اداکاروں کے لیے ہدایتیں بھی لکھ دی گئی ہیں، جو سرسری نظر میں اس بیان کا جز معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں یہ ڈراما موجودہ تہذیب کتابت کے مطابق لکھا جا رہا ہے۔ ڈرامے کی اصل عبارتیں کسی قدر جلی خط میں ہیں اور ہدایتیں ذرا خفی خط میں۔ کتابت کی تہذیب بدل جانے سے جو الفاظ بے کار ہو گئے وہ حذف کر دیے گئے ہیں۔ دو چار جگہ کسی ہندی لفظ کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ متن میں کوئی تصرف نہیں کیا گیا ہے۔

بنی میں رادھا کنھیا کا ایک دوسرا قصہ بھی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کے وقت واجد علی شاہ کو کلکتے میں رہتے ہوئے بیس برس ہو چکے تھے۔ معلوم نہیں کہ یہ دوسرا قصہ انھوں نے لکھنؤ میں لکھا یا کلکتے میں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

ڈرامے کے افراد

صحرا .... ایک غم زدہ عورت، جس نے جوگ لے لیا ہے

غربت .... جوگن کا خادم

عفریت .... ایک دیو

ارغوان پری
زعفران پری .... دو پریاں

کنھیا .... ناٹک کے نائک (ہیرو)

رادھا .... ناٹک کی نائکہ (ہیروئن)

للتا
ساکھا
چمپا
لڑوا .... چار سکھیاں

رام چیرا .... کنھیا کا منھ چڑھا ملازم

ایک مسافر .... متھرا، بندرابن سے آتا ہوا۔

چار پنہارنیں

چار مکھن والیاں

رادھا کنھیا کا قصہ

دو سکھیاں کار چوبی پر لگا کر بھاری جامۂ حسن[1] پہنیں۔ ایک کا نام ارغوان پری، دوسری کا زعفران پری ہو۔ اور ایک مرد بہ شکل دیو کریہ منظر بنے۔ اس کا نام عفریت ہو۔ اور ایک سکھی جوگن بنے۔ اس کا نام صحرا ہو۔ اور ایک مرد خادم جوگن کا بنے۔ اس کا نام غربت ہو۔ بعد ختم رہس[2] سب سکھیاں بیٹھ جائیں۔ اور ایک جانب دونوں پریاں کرسیوں پر بیٹھیں۔ اور ایک طرف جوگن کرسی پر اجلاس کرے۔ اور دیو پریوں کے سامنے گرز لیے ہاتھ باندھے کھڑا ہو۔ اور غربت جوگن کے سامنے دست بستہ استادہ ہو۔ اور ایک جانب رادھا کنھیا مکٹ اور بینا[3] لگائے ہوئے گھونگھٹ بنگالہ[4] لگائے ہوئے، کرسیوں پر اجلاس کریں اور رام چیرا دونوں کی خدمت میں دست بستہ حاضر ہو۔ اور چار سکھیاں ایک کا نام للتا، دوسری ساکھا، تیسری چلیا، چوتھی لڑاوا، جیغہ کلغی لگائے ہوئے جھرمٹ کیے ہوئے علٰحدہ کھڑی ہوں۔ اور

۱؎ جامۂ حسن۔ غالباً واجد علی شاہ کا ایجاد کیا ہوا کوئی لباس

۲؎ ’’رہس‘‘ سے یہاں حلقے کا ناچ مراد ہے

۳؎ ’بینا‘ ماتھے پر لگانے کا ایک زیور

۴؎ یہ ہدایتیں کلکتے میں لکھی گئی تھیں۔ اس لیے بنگالی گھونگھٹ کا ذکر آگیا۔

چار پنہا رنیں مصنوعی کنوئیں سے ، ٹھمری گاتی ہوئی راقم کی تصنیف

پانی بھرتی ہوئی ہوں ۔ اور ایک مرد مسافر کی صورت میں بنا ہوا مع

گٹھری اور عصا بدست حاضر ہو ۔ اور چار مکھن والیاں ہوری راقم

کی تصنیف گاتی ہوئی اور مکھّن نکالتی ہوئی ہوں ۔ ۔ جوگن کو چاہیئے

غم زدہ بیٹھنا ۔

غربت (صحرا سے) جگ جگ جیو ، آنند رہو ، جوگن صاحب ! کیوں ملول ہو ،

کاہے جیا ملین ہے ؟

صحرا ۔ چوبیس برس ہوئے ایک رنج ہے ۔

غربت ۔ وہ کیا رنج ہے ؟ ہم سے کہنے کا ہو تو کہئے

صحرا ۔ چوبیس برس ہوئے تھکا اس غم میں کہ رادھا کنھیا کا ناچ نہیں دیکھا

غربت ۔ بس آپ کو اسی کا غم ہے ؟ جاتا ہوں تدبیر کرنے کو

غربت چلا اور عفریت سے علیحدہ ملاقات کی ۔

غربت ۔ سلام علیکم میاں عفریت !

عفریت ۔ وعلیکم السّلام ، التّین واللّام ، الطعام والکلام ، الکشمش والبادام ،

میاں غربت علی خاں ، بہادر بہادران ، کھٹ پٹ جنگ ، نامردے ، دھ بڑ چود

پھر دونوں بغل گیر ہوئے ۔ عفریت اس طرح سے ہنسا ۔

کاؤں کاؤں ، کھل کھل کھل کھل ،

غربت ۔ میاں عفریت ! ہمارے تمھارے مدّت سے بھائی چارا ہے ۔ ہم تو تم

سے ایک امر ضروری کہتا ہے ، اگر تم سے ہو سکے ۔

عفریت ۔ کیا کام ہے ؟

غربت ۔ ایک جوگن ہو اس کو ایک غم ہے ۔

عفریت ۔ وہ کون سا غم ہے ؟

غربت ۔ جوگن صاحبہ کہتی ہیں کہ مجھے رادھا کنھیا کا ناچ نہ دیکھنے کا غم ہو ہیں وعدہ کر آیا ہوں کہ کوشش کرتا ہوں ۔ اگر تم سے ہو سکے تو وعدے کو پورا کرو

عفریت ۔ تینتی مینتی ، دم خبیثی ، او ٹنگ لاٹا ، جھونکٹ جھانٹا ، صندوق معلق ، ثری گاو کی دم اور بچھوؤں کی قسم جوگن کے لیے بر آئد مطلب ہوگا ہرگز دریغ نہ کروں گا ۔ میں سعی کرتا ہوں ۔

بس اسی وقت عفریت غربت کو ہمراہ لے کر روانہ ہوا ۔

عفریت (غربت سے) ۔ بابا ساتور بازی ، حمال بازی ، نیزہ بازی ، خلال بازی شمشیر بازی ، اراست بازی ، چل میرے ساتھ

بحضور زعفران پری اور ارغوان پری حاضر ہوا ۔

عفریت ۔ (پریوں سے) ایک جوگن رادھا کنھیا کے ناچ کے غم میں جوگن ہوئی ہے اور چاہتی ہو کہ وہ ناچ دیکھے ۔

پریاں ۔ جوگن کو لے آ ۔

عفریت غربت کے ہمراہ جوگن کے پاس آیا ۔

غربت (صحرا سے) جوگن صاحبہ چلو ۔ پریوں نے بلایا ہو ۔

جوگن صاحبہ مع غربت و عفریت پریوں کی خدمت میں حاضر ہوئیں ۔

عفریت ۔ (پریوں سے) جوگن حاضر ہے ۔

پریاں ۔ بلاؤ ۔

جب جوگن آئیں دونوں پریاں اٹھ کر بغل گیر ہوئیں ۔

پریاں ۔ (صحرا سے) ۔ کیا تم کو ہوا ؟ کیوں جوگ لیا ؟

صحرا ۔ چوبیس برس سے یہ غم دامن گیر ہو کہ کسی طرح سے رادھا کنھیا کا ناچ دیکھوں

پریاں ۔ ارے عفریت ! رادھا کنھیا کا ناچ جوگن کو دکھا دے ۔

عفریت (چلا کر) ہیبت عفریت رادھا کنھیا اور سکھیوں پر ۔ رادھا ! کنھیا ! سکھیاں ! ناچو ہنڈولے کا ناچ ۔

اس وقت سب سکھیاں برابر استادہ ہوں اور ایک سرا ڈوپٹے کا کنھیا تھامیں ، دوسرا سرا رادھا جی وسط صف میں تھامیں اور یہ ہنڈولا گاتی جائیں اور ایک دو کے پانوں تال میں لگاتی جائیں ۔ اور سب سکھیاں متابعت رادھا جی کی کرتی جائیں ۔ اور کنھیا جی پیش قدمی پر مقابل رادھا کے ہو کر ڈوپٹا کھینچ لیا کریں اور پس قدمی پر ڈھیل دیا کریں ۔

آستائی ۔ ہنڈولا جھولے شیاما سیام گھنے سے گھنا چلت پون سنہ ننہ سنہ ننہ سنہ ننا ۔

پہلا انترا ۔ سب سکھیاں مل پینگ بڑھاڈے کے تان تنہ ننہ تنہ تنہ تنہ ننا ۔

دوسرا انترا ۔ مور مکٹ کٹ راکھر واکنڈ رپائل باجے جھنہ ننہ جھنہ ننہ جھنہ ننا

بعد اختتام ہنڈولا سب سکھیاں ، راجا رام چندر کی جے ، کہیں ۔ بعد رادھا کنھیا مقابل استادہ ہوں اور نصف سکھیاں کنھیا کی جانب اور آدھی رادھا کی طرف کھڑی ہوں اور رادھا کنھیا سے سوال و جواب شروع ہوں اور ادھر بھاؤ ہوتا جائے اور ادکان بطور چکروں بائیں داہنی جانب سے

دونوں کے پاؤں سے ہر بیت اور دوہرے کے بعد ادا ہوتے جائیں۔

رادھا (بیت) مجمع غیر میں ایسا ستم ایجاد کیا

قاتلا! بھول کے ہم کو نہ کبھی یاد کیا

(دوہرا) میں برہنی سنجوگ سنگ کو نہ کو ؤ ساتھ

ناری چھووت برکے بید پھپھلا ہو گئے ہاتھ

کنھیا (بیت) نام میرا ہو کنھیا میں تجھے جانتا ہوں

رادھا جی جان سے میں تجھ کو یہاں مانتا ہوں

(دوہرا) رادھا جی کے انگ پر سندیا ات چھب دیت

مانو پھولی کیت کی بھونرا باسن لیت

رادھا (بیت) میں ترے عشق میں دیوانی ہوئی اے کانا[1]

میں نے جی جان سے تجھ کو تو یہاں پہچانا

(دوہرا) آؤ پیارے موہنا پلک ڈھانپ تو ہے لیوں

نا میں دیکھوں اور کو نا تو ہے دیکھن دیوں

کنھیا (بیت) عشق میں تیرے رادھا جی جنگل چھانا

دیو پری نے بھی مجھ کو کہیں نہیں پہچانا

رادھا (دوہرا) سیس مکٹ کٹ کاچھنی کر مرلی اُر مال

یہ بانک موہن لبے سدا ہماری لال

کنھیا (دوہرا) رادھا دوارا دور ہو جیسے پنڈ کھجور

چڑھے تو چاکھے پریم رس گرے تو چکنا چور

۱؎ کانا = کانھا، کنھیا کے لیے پیار کا لفظ۔

(دوہرا) سائیں جھروکے بیٹھ کے سب کا مجرا لے
جیسی جا کی چاکری ویسا واکو دے

اس دوہرے کے بعد کنھیا حاضرین اور ناظرین سب کو زر چا کری تقسیم کرے اور سب ہاتھوں میں لیں اور سر سے اور آنکھوں سے لگائیں اور چومیں۔

رادھا (دُوہرا) ندی کنارے دُھواں اُٹھے رہے میں جانوں کچھ ہوئے
جا کے کارن جوگ کما یا وہو نہ جرتا ہوئے

منہ مہتاب واگلابی چشماں دی ہاتھ وچ سونڑاں دی ہتکڑیاں
دل بھی دیکھا پردیس بھی جاندا راہ دی وے کھڑا کھڑیاں
کھول طبیباں باٹیاں تیں ہنڈے الڑے گھاو نہ چھیڑ
جیتو درد بٹاون میر بچھڑے جانے میر

(دُوہرا) تم داناودُ جگ کے تم لگ ہمری دوڑ
جیسے کاگ جہاج کو سوجھت اور نہ ٹھور

(دُوہرا) کاہا تم مت جانیو تم بچھڑن پیت گھٹی
جیسے بیلی پوئے کی دن دن ہوت ہری

(دوہرا) کاگا سب تن کھائیو اور چن چن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس

(دوہرا) ہنسنی والے موہنا ہمری اور تو دیکھ
ہیں تو ہے راکھوں نینن ماں کاجر کی سی ریکھ

کنھیا (دُوہرا) رادھا کاہے دور ہو گھرا نگناں نہ سہائے
جیوں مہندی کے پات ماں لالی لکھی نہ جائے

رادھا ۔ راجن کے راج ادھراج مہاراج جگ جگ جیو آنند رہو ۔ وہ مرلی جا میں چھ راگ چھتیس راگنیاں باجت تھیں وہ مُرلی کہاں پہ چھوڑ آئے وہی مُرلی بجاؤ ۔

کنھیا (گود پھیلا کر) راجن کی راج ادھرانی مہارانی کا نفا اسیس دیت ہو جگ جگ جیو آنند رہو ۔ رام وہاں وہ مرلی کھوے گئی ۔

رادھا ۔ مہاراج ہیں تم کا کھوب چینھت ہوں ۔ تم کبری[1] کو دے آئے ہو ۔

یہ کہہ کر رادھا جی خفا ہو گئیں اور روٹھ کر علیحدہ بیٹھیں ۔ اس وقت کنھیا جی یہ ٹھمری گا کر ارتھ بھاؤ کرنے لگے اور پاؤں پر گرنے لگے اور ہاتھ باندھ کر مناتے لگے ۔

کنھیا (آستائی) میری مہارانی رادھا رانی
(انترہ) کا مو سے کچھ چوک پڑی موری رانی اکھتر کد رنہ جانی

پھر مجبور ہو کر کنھیا جی رام چیرا اپنے ملازم کو پکارتے ہیں

کنھیا ۔ رام چیرا !

رام چیرا ۔ حاجر مہاراج ! ۔ حاجر ۔

رام چیرا ۔ (حاضر ہو کر) راجن کے راج ادھرراج مہاراج شیو پر دھان چھتر پتی ! بتاؤ تو کیا ہوا ۔

کنھیا ۔ رادھا کا خفا ہو گئیں ۔ جانت ہیں کہ ہیں مُرلی کبری کو دے آیا ہوں

رام چیرا ۔ مہاراج ! پھر مناؤ ۔

---

[1] کُبری ۔ کبڑی ۔ کنھیا کی ایک معشوقہ جس کے کبڑے بدن کو سیدھا کر کے انھوں نے ایک حسین عورت بنا دیا تھا ۔ رادھا اس سے بہت جلتی تھیں

اسی طرح تین مرتبہ رام چیرا طلب ہو اور وہ یہی عرض کرے

چوتھی مرتبہ رام چیرا عرض کرے۔

رام چیرا۔ مہاراج! اب کسی سکھی کو بیچ میں ڈال کے صفائی کر لو۔

کنھیا۔ اری للتا!

للتا۔ آئی مہاراج۔

تال میں پھرتوں کے ساتھ ایک دو ایک دو ناچتی ہوئی حاضر ہو اور بیٹھ جائے۔

کنھیا۔ اے للتا! ہمری رادھا ہم سے نہیں مانت ہیں۔ کیا کروں؟

للتا۔ بنتی کرو، ناک رگڑو، پیاں پڑو، مونڈ گھسو، چروری کرو۔ جب تو منہیں

کنھیا۔ میں نے سب جتن کیے۔ وہ ناہیں مانت ہیں، ور تیرے کہنے سے پھر مناتا ہوں۔

دوبارہ کنھیا پھر منائیں اور یہ ٹھمری گائیں اور بطریق اوّل منت سماجت سے ارتھ بھاؤ ادا کریں۔

کنھیا (آستائی) رادھا جی موسے بولو کیوں نہ ارے۔

(انترا) کا موسے کچھ چوک پڑی موری رانی ہنس ہنس گھونگھٹ کھولو کیوں نہ ارے۔

اسی طرح سے چار دفعہ رام چیرا ے شکوہ کریں اور بموجب عرض رام چیرا تینوں باقی ماندہ سکھیوں کو بھی اسی طرح تال میں بلائیں اور وہ سکھیاں منت وہی کلمات مرقومۂ بالا عرض کریں۔ جب چوتھی سکھی کے آنے کی باری ہو اس وقت کنھیا جی یہ ٹھمری گائیں اور الحاح و زاری و بے قراری مثل دفعات اولی عمل میں لائیں۔

کنھیا۔ (آستائی) موری تو جیون رادھا۔

(انترا) پتیاں پروں میں توری للتا، توری ساکھا، توری چینا، توری ر
تورے بن دیکھے نہیں چین۔

اس انترے کے گانے میں جس سکھی کا نام آئے اس کی منت کریں اور
پاؤں پڑیں۔ پھر سب سکھیاں کھڑی ہو جائیں، پر رادھا بیٹھی رہیں اور کہیں
تال سُر ہیں۔

رادھا۔ دیدی اتا تا تا تا تھئی دیدی اتا تا تا تا تھئی۔

(انترا) تھئی تھئی تھئی، دی دی اتا تا تا تا تھئی دیدی اتا تا تا تا تھئی۔

اور کنھیا جی بھی اٹھ کھڑے ہوں اور تال سُر میں کہیں۔

کنھیا۔ رادھا رادھا رادھا کنج گلن میں رادھا رادھا کنج بھون میں
رادھا رادھا۔

اور ناچتے جائیں اور ٹکڑے اور توڑے پاؤں سے لیتے جائیں۔

اس وقت رام چیرا عرض کرے۔

رام چیرا۔ مہاراج رادھا کو داتا سے مانگو اور تپسیا کرو، شاید مل جائیں۔

اس وقت کنھیا جی آسن مار کر داہنے ہاتھ سے ناک پکڑ کر سانس روکیں
فوراً رادھا جی اٹھ کر گلے سے چمٹ جائیں۔ پھر سکھیاں لڈو پوجا کریں، لڈو
پوجا کی ترکیب یہ ہو۔ کنھیا جی گال پھلا کر ایسی آنکھیں بنائیں کہ پتلیوں کو
حرکت نہ ہو اور بائیں پاؤں کے بل کھڑے ہوں اور داہنے پاؤں کی ایڑی
بائیں پاؤں کے گھٹنے پر رکھیں اور چار سکھیاں داہنے گھٹنے زمین پر ٹیک کے
بائیں پاؤں بلند زمین پر دھر کر دونوں ہاتھوں کو ڈنڈا کر کے گول شکل پنجوں
کی مثل نشان بناتے لڈو کی گلائی اور دور کے مانند بنائیں اور ان بنے ہوئے

ہاتھوں کو تال سے نچاتی جائیں اور حرکت دیتی جائیں اور وقت گردش ہاتھ
دستی ہر مرتبہ تال میں کنھیا جی کے پھولے ہوئے گالوں پر گچکا یعنی ٹھوکا اور
ضرب، جیسے ہلکا گھونسہ مارتے ہیں، ٹھکی باندھ کر دی جائیں اور یہ الفاظ
گاتی جائیں۔

سکھیاں۔ لے لے لالہ لڑوا لے۔

لڈو پوجا کے بعد سب سکھیاں برابر استادہ ہوں اور یہ دوہرا گائیں۔

سکھیاں۔ (پہلا تک) ایک ناربیا کل بھئی برچھی لگی جگ والے
(دوسرا تک) اے بدھاتا تو موہے پنکھ تو دے تو میں جائے کروں درشن
پیا کے۔
(تیسرا تک) سمجھائیں سکھیاں مت سوچ کرو بن اودھو بوجھے نہ جمیں پر واکے
(چوتھا تک) اور جو پنکھن ہی سے ہو ملیں تو بالی کیا پنکھ نہیں پکھوری چکوا کے۔

جب سب سکھیاں چاروں تک گا چکیں تو برابر برابر بیٹھ جائیں اور
کنھیا جی کھڑے ہوکر یہ دوہرا گائیں۔

کنھیا۔ (پہلا تک) مرلی ہمری کھوئے گئی متھرا بندرابن کی ریت
(دوسرا تک) نا موہے سوجھت اور چھور نا موہے سوجھت کھیت

رادھا۔ مہاراج! جبھی خوش ہوں گی جب مرلی ڈھونڈھ کر لا دوگے۔

کنھیا۔ اچھا مرلی ڈھونڈھ لاتا ہوں۔

فوراً کنھیا جی اسی وقت مرلی ڈھونڈھیں اور ہر ایک سے یوں دریافت
کریں۔

کنھیا۔ ہمری مرلی کسی نے دیکھی ہے؟

رام چیرا ازراہ مزاح یہ جواب دے

رام چیرا۔ ہمری مرگی کسی نے دیکھی ہو؟

کنھیا جی اسے گھونسہ مار کے اور گردنی دے کے وہاں سے نکال دیا اور ہنس کر کہیں۔

کنھیا۔ ہم مرلی ڈھونڈھت ہیں کہ مرگی؟

رام چیرا دوبارہ کہے

رام چیرا۔ مہاراج تمھاری مرلی کے دو سینگ بھی اور دم بھی ہو؟

پھر کنھیا جی اسے گھونسہ ماریں اور گردنی دیں اور پھر بانسری کے تفحص اور تجسس میں مصروف ہوں اور کلمۂ اول کہیں۔

کنھیا۔ ہمری مرلی کسی نے دیکھی ہو؟

پھر رام چیرا کہے۔

رام چیرا۔ ہماری بھینس کسی نے دیکھی ہو؟

پھر کنھیا جی حرکات مسبوق الذکر بجا لائیں۔ اس درمیان میں چار دو پنھیارنیں چاہ مصنوعی سے بہ ٹھمری راگ کی گاگا کر پانی بھرنے لگیں۔

پنھیارنیں (استائی) سب راہ باٹ میں ڈھونڈھ پھری بندرابن میں ہو سانوریا جنگل جنگل سنسان بھیو سُن پائی کیسی بانسریا۔

(انترا) پگ دھرت دھرت لٹ پلٹ گیو۔ ہنگھٹو اگاگر الٹ گیو کر پکرت کنگن اچٹ گیو چل چھانڑ دوے اکھڑ بانگریا

اس وقت کنھیا جی ناچار ہو کر مسافر سے پوچھیں۔

کنھیا۔ میاں مسافر! کہاں سے آتے ہو؟

مسافر۔ متھرا بندرابن سے آوت ہوں ۔

کنھیا۔ ہماری مرلی کبھی کسی کے پاس دیکھی ہو؟۔

مسافر۔ ہاں دیکھی ہو۔ وہ چار پنھیارنیں کنوئیں پر پانی بھر رہی ہیں۔ ان میں ایک جو گوری، ٹھمکی، ناٹی سی ہو واہی لین ہو۔ مانگ لاؤ۔

کنھیا۔ (پنھیارنوں سے بہ منت ہاتھ باندھ کر) ہم تمہیں لڈو کھلائیں گے۔ ہمری مرلی دے دو۔

پنھیارنیں ۔ (کنھیا کو ڈھکیل کر)۔ جاؤ جاؤ ۔ ہٹو ہٹو ۔ یہاں مُرلی نہیں ہو۔

"کنھیا جی ہر ایک کی منت اور سماجت کریں اور وہ چاروں باری باری ہلکے ہلکے گلچے یعنی گھونسے کنھیا جی کے گالوں پر لگائیں اور دھکے دیدے کر ہٹا ہٹا دیا کریں۔ آخر سارنگی تھکے ۔

ایک پنھیارن ۔ راجن کے راج ادھر راج مہاراج شیو پردھان جگ جگ جیو آنند رہو۔ تا جا تا جا ماکھن لادو تو ہم دیں۔

کنھیا جی ماکھن لا دینے کا اقرار کر کے اس کے تجسس میں رواں ہوں اور چاروں پنھیارنیں کنوئیں پر دہی ٹھمری گاتی رہیں۔ مگر سوال دجواب کے وقت شور وغل نہ ہوا کرے اور سازندوں کے سازوں کا بجنا بھی موقوف ہو جایا کرے۔

کنھیا۔ (ماکھن والیوں سے) جگ جگ جیو آنند رہو تھوڑا سا ماکھن دو

ماکھن والیاں سینی پر مٹکی دھرے ہوئے متھانی سے چاروں دہی متھتی جائیں اور یہ ہولی تصنیف راقم گاتی جائیں۔

ماکھن والیاں (استائی) اے دئی میں ماکھن بیچن جات

(انترا) نالو کا ہفاتم ماکھن مورا بیچوں اکھتر ہات

جب کنھیا جی ماکھن طلب کریں ماکھن والیاں جواب میں اسی ہولی کا انترا گا دیا کریں۔ آخر ایک ماکھن کی سیلیں ماکھن والیوں کی آنکھ بچا کر چرا لائیں اور رنبھیا رتوں کو دیں اور اُن سے مرلی لیں اور بجائیں۔ رادھا جی مرلی کی آواز سنتے ہی دوڑ کر کنھیا جی کے گلے سے چمٹ جائیں اور بدل راضی ہو جائیں۔

رادھا۔ (کنھیا سے) تمہارا ج کا بول بالا رہے۔ اب مورمن کُس بکھو ا۔ تم گدی پر براجو۔ میں تمھرے آگے گاوت ناچت ہوں۔

اسی وقت سازندوں کے بیچ میں جا کر یہ ٹھمریاں گائیں اور خوب دل سے اتھ بھاؤ مکھ بلاس سمیت ادا کریں۔

رادھا۔ (آستائی) بجن لاگی سیام کی بانسری رے

(انترا)۔ ندیا کنارے اکھتر بانسری بجاوت نکس جات جیا سے مانش رہی رے

قصہ ختم ہوا